آتشِ حسد

کاشف زبیر

غرور دولت کا ہو یا اقتدار کا، بالآخر حسد کی آگ میں جلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اُس شخص کا ماجرائے عبرت جو اپنی ہر ضرورت دولت کے ذریعے پوری کرنے کا عادی ہو چکا تھا لیکن محبت تو دولت کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس امتحان میں جب وہ ناکام ہونے لگا تو اُس نے ایک معصوم کی زندگی سے کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک نالائق اور بد باطن شخص اور اس کے ہم جماعت کی باہمی چپقلش کا دلچسپ احوال۔ دونوں کے درمیان حُسن و محبت کی ایک دیوی جلوہ آرا تھی۔ دونوں اس کے حصول کے لیے کوشاں تھے لیکن اُن کے طور طریقے جُدا جُدا تھے۔

قدرت کے نظامِ انصاف کا دلچسپ نظارہ۔ زبردست وزیر داست کی کشمکش کا سبق آموز انجام

طارق عباس کے چہرے پہ چھائی ہوئی دہشت اور رحم کی اپیل میرے اندر ٹھنڈک بکھیر رہی تھی۔ جیسے جلتے زخم پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا جائے۔ وہ سوئمنگ پول میں تیرتا ہوا باہر آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا مگر میں اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا رہا تھا۔ ایک دفعہ وہ جیسے ہی باہر آنے کے لیے پول کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میرے جوتے کی ٹھوکر اس کے ماتھے پر پڑی اور وہ الٹ کر پانی میں جا گرا۔ ماتھے کی کھال پھٹ گئی اور خون چہرے کو بھگوتا ہوا پانی کو سرخ کرنے لگا۔ اس کا خون بہتا دیکھ کر نجانے کیوں مجھے سفاک سی مسرت ہوئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسی طرح اس کے پورے جسم پر ٹھوکروں سے زخم سجا دوں۔ وہ سر سے پاؤں تک اپنے ہی لہو میں ڈوب جائے۔ نجانے میں یہ کیوں بھول رہا تھا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں جس کا کام زخم پر مرہم رکھنا ہوتا ہے، زخم لگانا نہیں۔

"خدا کے لیے فراز" وہ ہاتھ چلاتا ہوا گھگیایا۔ "میرے بازو شل ہو گئے ہیں۔ مجھے باہر آنے دو۔" اس کے لہجے میں التجائیں مچل رہی تھیں۔

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ شاید وہ اسے میری رضا مندی سمجھا اور ایک بار پھر پول کی سیڑھیوں کی طرف آیا۔ اب کے میں نے اسے زیادہ اوپر آنے دیا۔ اور پھر ایک بھرپور ٹھوکر اس کی ناک پر رسید کی۔ وہ تڑپ کر ہوا میں اچھلا اور غڑاپ سے پول کے وسط میں جا گرا۔ اس ٹھوکر کے پیچھے میری تمام تر نفرت موجود تھی۔

جب وہ دوبارہ پانی سے ابھرا تو تقریباً نیم بے ہوش تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور بازو ان چپوؤں کی طرح پڑ رہے تھے جن کے چلانے والے نشے میں ہوں۔ وہ ڈوب رہا تھا اور میں پوری بے رحمی سے اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

آخری غوطہ کھانے سے قبل اس نے آنکھ کھول کر مجھے دیکھا اور پھر اس کا سراپا پانی کی چادر کے نیچے غائب ہو گیا۔ پول کی پرسکون ہوتی ہوئی سطح پر اب بھی خون کی لالی پھیلی ہوئی تھی جو آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالے اور سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

اس کے بعد یہ کوئی زلزلہ ہی تھا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور وہ واقعی زلزلہ ہی تھا۔

"اوئے یہ سیٹی بجانے کا کون سا ٹائم ہے ڈے۔ دن بھر یہ تمہارا باپ پولیس والا ہم کو سونے نہیں دیتا اور رات کو تم سیٹی مار کر جگا دیتا ہے۔"

یہ قاسم دادا تھا جس کے دوست پیار سے اور دشمن خار سے اسے زلزلہ کہتے تھے۔ جب وہ غصے میں ہوتا تو زلزلے کی ہی طرح اپنے دشمن کو نیست و نابود کر دیا کرتا تھا۔ اسے جرائم کی دنیا میں قدم رنجہ ہوئے صرف پانچ سال کا عرصہ ہوا تھا مگر اس نے نہایت تیزی سے ترقی کی تھی۔ جیب کترے کی حیثیت سے کیریئر کا آغاز کرنے والے قاسم دادا نے بہت کم عرصے میں زیرِ زمین دنیا میں اہم حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اتنی جلدی اوپر آنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ طاقت کے ساتھ ساتھ عقل سے بھی کام لینا جانتا تھا۔ جب کہ دیگر جرائم پیشہ گروہوں کے سربراہ ان میں سے کسی ایک ہی وصف کے حامل تھے۔

چیتے کی طرح مکار و سفاک، شیر کی طرح دلیر، ہاتھی کی طرح طاقتور، گینڈے کی طرح مضبوط اور لومڑی کی طرح معاملہ فہم قاسم دادا کبھی کبھی چھٹیاں منانے جیل میں آجاتا تھا کیونکہ باہر کام اس کی جان نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جیل میں بھی وہ اتنے ہی احترام اور عیش سے رہتا جتنا کہ اپنے گھر میں رہ سکتا تھا۔

خدا معلوم یہ میری بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ مجھے اس کے

UrduPhoto.com

ساتھ رکھا گیا تھا۔ اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ یعنی پل میں تولہ پل میں ماشہ ٹائپ کی شے تھا۔ بالکل پرانے بادشاہوں کی طرح کبھی گالی پر بھی انعام اور کبھی قصیدے پر سزا۔

"معاف کرنا دادا" اسے جیل میں دادا ہی کہا جاتا تھا۔

"پھر کوئی خواب دیکھ لیا" وہ لیٹنے کے بجائے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر سے آتی مدھم روشنی میں اس کے سیاہ چہرے کے کرخت خدوخال چمک رہے تھے۔

"ہاں دادا" میں نے ٹھنڈی سانس بھری "اب تو صرف خواب ہی رہ گئے ہیں۔"

"اڑے یہ تم بزدل لوگ صرف خواب دیکھ سکتا ہے" وہ حقارت سے بولا "حقیقت کا سامنا کرتے تم لوگوں کی.... ہے" خالی جگہ میں کی جانے والی بات ناقابلِ اشاعت ہے اور شاید یہ بات کہہ کر بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی۔

"اڑے یہ تعلیم بزدل بنا دیتی ہے' زنخا بنا دیتی ہے مرد کو۔"

"دادا اگر یہ بات ہے تو تم بھی ہو" میں نے چرکا لگایا۔

"ہاں لیکن ہم نے سب پھینک دیا' جلا دیا جب امارا اماں بغیر دوا کے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ علاج کے لیے تم ڈاکٹر لوگ پیسہ مانگتا تھا جو امارے پاس نہیں تھا" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

یہ حقیقت تھی کہ قاسم جرائم کی دنیا میں آنے سے قبل ایک اچھا طالب علم تھا پھر حالات اسے وہاں تک لے آئے جہاں اس کا حلیہ' لہجہ اور شکل سب بدل گئی۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کے انداز میں ایک ڈھکی چھپی سی شائستگی آجاتی تھی۔ جو صاحبِ علم لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

"دادا سو جاؤ! ویسے بھی صبح تم نے پیشی پر جانا ہے" میں ٹالنے کے انداز میں بولا ورنہ وہ مزید کئی گھنٹے مجھے بور کرسکتا تھا۔

○☆○

"اے دوستی کرو گے مجھ سے" میرا ہم عمر لڑکا مجھ سے کہہ رہا تھا۔ وہ میری ہی کلاس میں پڑھتا تھا۔ وہ خاصا گورا چٹا اور صحت مند لڑکا تھا۔ بال بھورے اور بھوری ہی آنکھیں تھیں مگر ان سے مکاری سی جھلکتی تھی۔ اس کا یونیفارم قیمتی کپڑے کا تھا۔ ہاتھ میں ایک الیکٹرونک گھڑی تھی۔ یونیفارم تو میرا بھی نیا تھا مگر اوسط درجے کے کپڑے کا بنا ہوا۔ جب کہ گھڑی میرے لیے خواب و خیال سے کم نہ تھی۔

میرے والد ایک اسپتال میں میل نرس تھے۔ جیسا کہ ہر باپ کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ جو وہ نہ کرسکا وہ اس کی اولاد کرے خصوصاً جب معاملہ اعلیٰ تعلیم کا ہو۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتے تھے انہیں اسپتال' مریضوں اور دواؤں سے اتنی محبت تھی کہ جب وہ کم وسائل کے باعث ڈاکٹری کی تعلیم نہ حاصل کرسکے تو نرسنگ کورس کرکے میل نرس بن گئے۔ انھوں نے شادی بھی ایک نرس سے ہی کی۔

چنانچہ جیسے ہی میں رونا دھوتا دنیا میں وارد ہوا فوراً ہی والدین کے دل میں ایک ڈاکٹر کے روپ میں جاگزیں ہوا۔ حتیٰ کہ وہ مجھے میرے اصل نام سے پکارنے کے بجائے ڈاکٹر بیٹا کہا کرتے۔ والدہ ماجدہ میں یہ جنون والد صاحب سے بھی دو قدم آگے تھا۔ چنانچہ مجھے جو پہلا جھنجھنا ملا وہ تھرمامیٹر کی شکل کا تھا۔ پہلی گاڑی ایمبولینس ٹائپ تھی اور گڑیا گڈے کے بجائے ایک عدد ڈھانچہ دیا گیا تاکہ میں بچپن سے ہی ان چیزوں سے مانوس ہو جاؤں۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے۔ میں خاصا بھونچال ٹائپ بچہ تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں چلنے کے بعد پورے گھر کو الٹنا پلٹنا میرا دل پسند مشغلہ تھا اور چیزوں کا پوسٹ مارٹم تو میں اس زمانے میں بھی بڑی خوبی سے کیا کرتا تھا۔ نچلا بیٹھنا اور دل لگا کر کوئی کام کرنا میری سرشت میں ہی نہیں تھا۔ والدہ صاحبہ اکثر حیران ہو کر فرمایا کرتی تھیں۔

"یہ خوش بخت میرے پیٹ میں نو مہینے کیسے رہ گیا۔"

میرے بعد مزید کوئی بچہ نہ ہونے کے باعث ان کی تمام تر توجہ اور توقعات کا مرکز میری ہی ذات تھی۔ اس بنا پر ان دونوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر میری پرورش کی۔ میری خوراک' لباس اور دیگر خواہشات کی تکمیل میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس کے جواب میں انہوں نے صرف ایک خواہش کا اظہار کیا کہ میں پڑھوں۔

یہ بات مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ کھیل کود میں زیادہ دھیان ہونے کے باوجود میں ان دونوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی تعلیم پر پوری توجہ دیتا اسی وجہ سے میرے ریکارڈ میں کہیں دوسرا درجہ نہیں ہے۔

والد صاحب اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ اچھی تعلیم صرف اچھے اسکول میں ملتی ہے اور اچھے اسکولوں کی فیس بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔

"رابعہ میں عاصم کو اچھے اسکول میں داخل کراؤں گا" وہ اکثر والدہ سے کہتے۔

"مگر ہم اتنی فیس کہاں سے دیں گے" وہ خدشات کا اظہار کرتیں۔

"اللہ مالک ہے اور پھر یہ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے اس کے لیے تو جو بھی کریں کم ہے۔"

پھر اپنے الفاظ کے مطابق انہوں نے ایک معیاری مگر مہنگے اسکول میں میرا داخلہ کرا دیا اس کے لیے انہیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑے' کہاں کہاں سے سفارشیں کرانی پڑیں اس کا مجھے آج تک پتا نہیں چل سکا کیوں کہ اس اسکول میں صرف امرا کے بچے پڑھا کرتے تھے۔ پہلے دن سے ہی اپنے اور دوسرے لڑکوں کے درمیان موجود طبقاتی امتیاز کا احساس میرے اندر جنم لے چکا تھا۔ کچھ میری غریبی نے اور کچھ ان کے انداز نے مجھے جتا دیا کہ تم اگرچہ اسکول میں

UrduPhoto.com

داخل ہو چکے ہو مگر ہمارے طبقے کے نہیں ہو۔

ان حالات میں اس لڑکے نے جب میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو میں باوجود اس کے مغرورانہ انداز کے وہ ہاتھ جھٹک نہ سکا۔ وہ کروڑپتی باپ کا بیٹا تھا جو ملک کا نامور ہارٹ اسپیشلسٹ تھا اور صرف مریض کو ہاتھ لگانے کے ہزار روپے لیتا تھا۔ وہ لڑکا روزانہ اپنی چمکتی دمکتی مرسیڈیز پر اسکول آتا۔ اس کا ڈرائیور بڑے ادب سے اس کے لیے دروازہ کھولتا اور اس کا بیگ اندر کلاس تک لے کر آتا۔ اب ظاہر ہے کہ مغرور وہ نہ ہوتا تو کیا میں ہوتا۔

وہ میرا کلاس فیلو بھی تھا اور پورے ایک ہفتے سے ہمارا برابر آمنا سامنا ہو رہا تھا مگر دوستی کا خیال اسے اب آیا تھا۔ چھٹی تک ہم میں خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ ہاف ٹائم میں وہ مجھے اسکول کینٹین لے گیا۔ وہاں پر اس نے برگر اور کوک لی۔ ایک شرمساری کے احساس نے مجھے آلیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا بے شک وہ دوست سہی مگر مجھے اس کی آفر قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ میرے احساسات سے بے خبر اپنی باتیں کرتا رہا۔ اپنے وڈیو گیمز کی، اپنے مہنگے جوگرز کی، اپنے پاپا کی اور ان کی دولت کی۔

اگرچہ مجھے کسی حد تک معلوم تھا کہ اس کی یہ مہربانی بے سبب نہیں ہے مگر یہ میرے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد اس کا بدلہ چاہے گا۔ چھٹی کے وقت اس نے اپنی دو عدد کاپیاں مجھے تھماتے ہوئے کہا تھا۔

”یار فراز پلیز میرا آج کا سائنس اور میتھس کا ہوم ورک کر دینا۔ میں دراصل آج مما کے ساتھ ایک کزن کی سالگرہ میں جا رہا ہوں“ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہانہ کر رہا ہے مگر میں کاپیاں واپس نہ کر سکا۔ اس کے کھلائے ہوئے برگر میرے اندر اچھلنے لگے۔

دوسرے دن جب میں نے اسے کاپیاں دیں تو اس نے بڑی بے نیازی سے شکریہ ادا کیے بغیر لے لیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس کے لیے میرے دل میں ناپسندیدگی نے جنم لیا۔ پھر اس کی کینٹین والی مہربانیاں مستقل ہو گئیں مگر اس کے ساتھ ہی اس کا ہوم ورک بھی مجھے کرنا پڑتا۔

میں خود کو تسلی دے لیا کرتا کہ اگر وہ مجھ پر پیسے خرچ کرتا ہے تو میں بھی اپنی محنت اسے دیتا ہوں۔ اتنا بہترین ہوم ورک وہ کبھی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیچر بھی حیران ہوتے تھے کہ اتنا اچھا ہوم ورک کرنے والا لڑکا ٹیسٹ اور امتحانات میں اتنا ڈل کیوں ہو جاتا ہے۔

دوستی کا یہ نام نہاد سلسلہ کینٹین اور ہوم ورک تک محدود تھا ورنہ ہمارے درمیان دوستوں والی کوئی بات نہ تھی۔ اسکول میں یہ بات زیادہ دن چھپی نہ رہ سکی۔ لڑکے مجھے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے تھے فقرے کستے تھے۔ میں ان پر توجہ ہی نہ دیتا۔ البتہ طارق کو کوئی کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ کرتا سب اس سے ڈرتے تھے۔

طارق کے سوا نہ تو کوئی لڑکا میرے قریب آیا اور نہ میں نے کسی سے دوستی کرنے کی کوشش کی۔ دراصل میری تمام تر توجہ پڑھائی پر رہی۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ میرے ماں باپ مجھے اس مہنگے اسکول میں پڑھا کر کتنی بڑی قربانی دے رہے ہیں۔ چنانچہ میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی اور طرف توجہ دوں۔

اسی وجہ سے ساتویں، آٹھویں میں لگاتار پہلی پوزیشن حاصل کی۔ آٹھویں میں تو میرے ریکارڈ نمبر تھے۔ آج تک اسکول کی تاریخ میں کسی طالب علم نے اتنے نمبر نہیں حاصل کیے تھے۔ اس پر اسکول انتظامیہ نے نہ صرف میری فیس معاف کر دی بلکہ مجھے ماہانہ وظیفہ بھی ملنے لگا۔ اس کے بعد میں نے طارق کی عنایات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے بھی کوئی خاص اصرار نہیں کیا۔ مگر اب بھی میرے بنائے ہوئے نوٹس پر وہ بڑی بے تکلفی سے ہاتھ صاف کر جاتا۔ پسند نہ ہونے کے باوجود میں ہوتا اسے منع نہ کر سکا۔

ان ہی دنوں امی جوڑوں میں درد ہونے کی وجہ سے ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ چنانچہ میری فیس وغیرہ اور اسکول کے اخراجات نہ ہونے کے باوجود گھر کے مالی حالات بدستور خراب رہے۔ اسی بنا پر میں نے ٹیوشن کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس پر امی نے خاصا ہنگامہ کیا ان کا کہنا تھا کہ مجھے اپنی پوری توجہ صرف اور صرف تعلیم پر دینی چاہیے مگر میں نے انہیں قائل کر کے دم لیا۔ یوں کم از کم میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے قابل ہو گیا۔

یونہی حالات کے مدوجزر سے گزرتے میٹرک پاس کر لیا۔ باوجود گھریلو ذمے داریوں اور ٹیوشن پڑھانے کے میں نے بورڈ میں ساتویں پوزیشن حاصل کی۔ اس پر بورڈ کی طرف سے مجھے میڈل ملی جب کہ اسکول والوں نے اسکول میں اول پوزیشن حاصل کرنے پر مجھے گولڈ میڈل اور پانچ ہزار کا کیش ایوارڈ دیا۔ طارق نے بھی اے گریڈ حاصل کیا مگر اس کی ذاتی محنت کا عنصر کم تھا اور نقل، سفارش اور رشوت کے عناصر زیادہ تھے۔

یہ گزشتہ پانچ سال میں پہلا موقع تھا جب مجھے اپنا آپ اس سے بلند لگا (حقیقت میں بھی میرا قد اس سے دو انچ بڑا تھا۔) مجھے مبارکباد دیتے وقت اس کی دلی کیفیت اس کے چہرے سے عیاں

UrduPhoto.com

تھی۔ وہ مارے حسد کے کباب ہوا جا رہا تھا۔
"چلو تمہاری مالی پرابلم تو کچھ حل ہوں گی" اس نے گھٹیا انداز میں کیش ایوارڈ کی طرف اشارہ کیا۔
"خیر میری مالی مشکلات اتنی خوفناک بھی نہیں ہیں کہ تم اس پر اظہارِ تشویش کرو" میں نے بے نیازی سے کہا جس پر وہ مزید تپ گیا۔
میٹرک کے عمدہ نتیجے کی وجہ سے شہر کے کئی اعلیٰ کالجوں نے مجھے اپنے ہاں داخلے کی پیشکش کی۔ عام حالات میں میں ان کالجوں میں سے کسی میں داخلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے میٹرک کے نتیجے پر والد اور والدہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مگر انہوں نے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ سوائے میڈیکل کے کسی دوسرے شعبے کے بارے میں سوچوں بھی نہیں۔ چنانچہ زیادہ رجحان نہ رکھتے ہوئے بھی پری میڈیکل میں داخلہ لے لیا۔ جس کالج میں میرا داخلہ ہوا وہاں اے ون گریڈ رکھنے والے داخلے کے اہل تھے۔
کالج میں طارق عباس کو دیکھ کر میرا وہی حال ہوا جو کسی نسل پرست گورے کا اس وقت ہو سکتا تھا جب اس کی گوری چٹی لڑکی ایک کلوٹے حبشی کو اپنا شوہر کہہ کر اس سے تعارف کرائے۔
"تم یہاں کیسے۔ یہاں تو صرف اے ون گریڈ والوں کو داخلہ ملتا ہے۔"
جواب میں اس نے مسکراتے ہوئے جیب سے ایک عدد لال نوٹ نکالا اور چوم کر واپس جیب میں رکھ دیا۔
"تو اب یہ شخص یہاں بھی میرے اعصاب پر سوار رہے گا۔ مجھے اپنے گھٹیا مذاق کا نشانہ بنا کر قہقہے لگائے گا" میں نے کڑھ کر سوچا۔
"میں نے سوچا کہ میرے بغیر شاید تمہارا دل نہ لگے" وہ استہزائیہ انداز بولا "ویسے بھی بابا کی خواہش تھی کہ میں ان کی طرح ڈاکٹر بنوں۔ وہ تو مجھے اسٹیٹ بھیج رہے تھے مگر میں نے ضد کر کے یہاں داخلہ لے لیا۔ میرا خیال ہے تم مجھے دیکھ کر خوش ہوئے ہوگے۔" وہ خباثت سے مسکرا رہا تھا۔ ظاہر ہے اب مجھ جیسا کاٹھ کا اُلو اسے امریکا میں ملنے سے رہا جو راتوں کو جاگ کر محنت سے بنائے ہوئے نوٹس اس کے حوالے کردے۔ مگر میں نے تہیہ کرلیا کہ اب اسے اپنی ذات سے ایک نمبر کا فائدہ بھی اٹھانے نہیں دوں گا۔
چنانچہ اس نے جب حسب عادت بغیر مجھ سے پوچھے بیالوجی کا جرنل اٹھایا تو میں نے جرنل اس سے واپس چھین لیا۔ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔
"یہ تم نے واپس کیوں لے لیا میں کوئی کھا تھوڑی جاؤں گا۔ کاپی کر کے واپس کر دوں گا۔"
"سوری طارق اب تمہیں خود سے محنت کرنے کی عادت ڈالنا ہوگی۔" میں نے [illegible] بازار سے خرید

لو۔"
"یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو" وہ سرد سی آواز میں بولا "اپنی اوقات مت بھولو' ایک وقت تھا جب تم میرے ہی......"
"ہاں مگر اس کا صلہ میں کئی گنا کر کے لوٹا چکا ہوں" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اس مقام تک میرے کندھوں پر چڑھ کر پہنچے ہو۔"
وہ چند لمحے شعلہ بار نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا۔
اس دن سے وہ صحیح معنوں میں میرا حریف بن گیا۔ مجھ سے مقابلے کے جنون میں وہ ہر اس کام میں ٹانگ اڑانے لگا جو میں کرتا تھا۔ میں نے تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کیا تھا اسے بھی یہ شوق چرایا۔ میں کالج کی سوئمنگ ٹیم میں شامل ہوا تو وہ بھی کوشش اور جوڑ توڑ کر کے ٹیم میں آگیا۔
جہاں تک تعلیم کا معاملہ تھا تو وہ نازو نعم میں پلا لڑکا میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی کمی اس نے دوسرے ذرائع سے پوری کرنے کی کوشش شروع کردی۔ ٹیچر اور پروفیسر سے اپنی پی آر بڑھانے لگا۔ بورڈ میں اس کے ڈیڈی کے تعلقات موجود تھے۔ چنانچہ فائنل ایگزام اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھے۔ صرف پریکٹیکل کے معاملے میں وہ مات کھا رہا تھا جس کی کمی دور کرنے کے لیے اس نے اساتذہ سے تعلقات بڑھانا مناسب سمجھا۔ یہ اور بات ہے کہ تمام کوششیں کر کے بھی وہ اس میدان میں مجھے شکست نہ دے سکا۔ البتہ میرے اور اس کے نمبروں میں فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ سمجھ لیں کہ معاملہ ہاکی کی زبان میں سڈن ڈیتھ تک چلا گیا تھا۔
چنانچہ وہ میڈیکل کالج میں بھی میرے ساتھ ہی براجمان ہوا۔ یہاں پر بھی مقابلہ تین سال تک بڑے کانٹے کا ہوا۔ پھر یا تو وہ اکتا گیا یا پھر کالج کی رنگینیوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ خاص طور سے تھرڈ سمسٹر کی نائلہ جبیں نے جو اس کے ساتھ اکثر دیکھی جانے لگی تھی۔ بہر حال اب میرا اور اس کا سامنا ذرا کم ہی ہونے لگا۔ زندگی کی مٹھاس کا مزہ چکھ کر اس کی زبان کی کڑواہٹ بھی کسی حد تک کم ہوگئی۔
اس طرح باقی کے سال میں نے بڑے سکون سے پڑھتے ہوئے گزارے اور کامیابی سے اپنا ایم بی بی ایس مکمل کرلیا۔ جس دن میرا نام فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کرنے والے طالب علم کے طور پر اخبار میں آیا تو والد اور والدہ صاحبہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالیں۔ دنیا کو چیخ چیخ کر اپنے ارمانوں کی تکمیل کی خبر سنائیں یا پھر مارے خوشی کے پاگل ہو جائیں۔ البتہ میرا مسئلہ دوسرا تھا۔ یہ میرے لیے کوئی جذباتی مسئلہ نہ تھا۔ مجھے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ ہاؤس جاب کے بعد کیا ہوگا۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں بے روزگار ڈاکٹر موجود تھے اور اتنے وسائل میرے پاس تھے

UrduPhoto.com

نہیں کہ پرائیویٹ پریکٹس کرسکوں۔ ان ہی سوچوں کے گھیرے میں جب میں نے ہاؤس جاب شروع کی تو یہ دیکھ کر تقریباً سر ہی پیٹ لیا کہ وہاں پر بھی طارق عباس موجود ہے اور میری مزید بدقسمتی کہ وہ میرے ہی گروپ میں تھا۔ تب میرے دل میں پہلی بار اسے قتل کرنے کی خواہش نے جنم لیا۔

○☆○

جنرل اسپتال میں میرے گروپ کے سربراہ ڈاکٹر قیوم تھے۔ ہاؤس جاب تو ویسے ہی ایک خاص پُرمشقت جاب ہوتی ہے مگر ڈاکٹر قیوم جیسے استاد کے ساتھ یہ قیدِ بامشقت بن جاتی تھی۔ ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور غربت کے ساتھ بڑھتے امراض اور نتیجے میں مریضوں کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا جب کہ سہولیات اتنی تیزی سے نہیں بڑھ رہی تھیں۔ چنانچہ ہمارا اسپتال اکثر ہاؤس فل کا منظر پیش کرتا اور کبھی کبھار تو برآمدوں میں بھی بیڈ لگانے کی نوبت آجاتی۔ ان حالات کی بنا پر ہاؤس جاب کا پہلا سال سخت مصروفیت میں گزرا۔

میرا اور طارق عباس کا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ کیونکہ اکثر ہماری ڈیوٹیوں کے ٹائم مختلف ہوتے چنانچہ ہماری مخالفت بھی کم ہوتے ہوتے خاتمے کے قریب پہنچ گئی مگر شاید خاتمہ اس کے نصیب میں نہ تھا۔ دوسرے سال ایم بی بی ایس پاس کرنے والوں کا نیا بیج آجانے سے نہ صرف میری مصروفیات میں کمی واقع ہوئی بلکہ اسپتال کے ماحول میں ایک رنگین سی تبدیلی کا احساس ہوا۔ اگرچہ رنگینیوں کی کوئی کمی نہ تھی اور ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور خوبصورت لیڈی ڈاکٹرز بھی موجود تھیں لیکن وہ سب نئے بیج میں شامل ڈاکٹر غزل کے سامنے ایسی ہی تھیں جیسے چاند کے سامنے ستارے یا گلاب کے آگے عام سے پھول۔

ڈاکٹر غزل کو مجسم غزل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور وہ تمام خصوصیات جو شعرائے قدیم سے لے کر شعرائے جدید تک اپنی محبوباؤں میں دیکھنا چاہتے تھے اگر جمع کی جائیں تو ان کا کم از کم نوّے فیصد ڈاکٹر غزل کے سراپا میں دیکھا جاسکتا تھا۔

پہلی دفعہ وہ جب ہمارے ساتھ راؤنڈ پر نکلی تو اکثر ڈاکٹرز کی توجہ مریضوں کے بجائے اس کی طرف ہی تھی۔ دیگر حضرات تو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے مگر میری مت کچھ زیادہ ہی ماری گئی تھی چنانچہ جلد ہی ڈاکٹر قیوم نے میری ٹکٹکی بندھی نظروں اور ان کے ہدف کو تاڑ لیا۔ اس وقت وہ ایک مریض کی حالت پر تبصرہ کررہے تھے۔

"ڈاکٹر فراز آپ کے خیال میں مریض کی اس حالت کا سبب کیا ہے؟" انہوں نے اچانک پوچھا۔

"سر....! میرا خیال ہے اس کا دل" میں نے گڑبڑا کر کہا جس پر ایک دبا دبا سا قہقہہ بلند ہوا۔ ڈاکٹر قیوم بھی بدمزگی سے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے مسکرائے۔

"میں نے آپ کی حالت کا نہیں اس مریض کی حالت کا سبب دریافت کیا ہے۔"

ان کے طنزیہ انداز نے مجھے پانی پانی کردیا۔ میں نے خود کو ڈانٹ پلائی۔ یہ کیا حرکت ہے میاں فراز' پہلے کیا کوئی لڑکی نہیں دیکھی جو ایسے ریشہ خطمی ہوگئے۔ میں نے اپنی آنکھوں کو تو کنٹرول کرلیا مگر دل کا کیا کرتا جو قابو سے باہر ہوا جارہا تھا۔ اس روز پہلی بار مجھ سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ ایک مریض کو وہاں سے انجکشن لگانے کی کوشش کی جہاں پر پلاسٹر بندھا تھا۔ نتیجے میں سرنج ٹوٹ گئی۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ کیونکہ بہ قول شاعر کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ والی صورتِ حال تھی۔

چنانچہ یہ بات بلکہ آگ شام تک سارے اسپتال میں پھیل گئی تھی۔ جہاں سے گزرتا' لوگ مسکراتے' سرگوشیاں کرتے یا پھر آوازیں کستے۔ ایک تو میرے اندر کی دنیا تہ و بالا تھی اوپر سے خلق خدا کا رویّہ۔ میں تنگ آکر ریسٹ روم میں جاگھسا۔

ریسٹ روم میں ڈاکٹر غزل پہلے سے موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر وہی تاثرات پیدا ہوئے جو ایک خونخوار شیر کے چہرے پر اسے زخمی کرنے والے شکاری کو دیکھ کر پیدا ہوسکتے ہیں۔ طوفان کے آثار دیکھ کر میں نے وہاں سے واپسی میں عافیت سمجھی۔

"ایکسکیوزمی ڈاکٹر میں سمجھا ریسٹ روم خالی ہے۔"

"حالانکہ آپ اسے خالی سمجھ کر ہرگز نہیں آئے ہوں گے" اس کی آواز سے وہ نرمی اور مٹھاس بھی غائب تھی جو صبح مریضوں سے گفتگو کرتے وقت موجود تھی۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" میں نے معصومیت کا اظہار جاری رکھا۔

"یہ سارا اسپتال کیا بکواس کررہا ہے" وہ گویا پھٹ پڑی "یہ سب آپ کی حرکت ہے۔"

پہلے تو میں اس جملے پر بھونچکا رہ گیا پھر سنبھل کر کہا۔

"دیکھیے' اس معاملے میں میرا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ لوگوں نے میرا جینا بھی اتنا ہی حرام کررکھا ہے اور ان ہی سے بچنے کے لیے میں یہاں آیا تھا کہ آپ گلے پڑ گئیں۔"

"سراسر آپ کا قصور ہے" وہ میری صفائی سے قطعاً متاثر نہ ہوئی "یہ جو آپ ٹکٹکی باندھ کر مجھے تاڑ رہے تھے اور ڈاکٹر قیوم نے آپ کو پکڑ لیا تھا....."

وہ غصے میں کہہ گئی مگر پھر اپنے جملے کے مفہوم کا احساس کرکے اس کا گلابی چہرہ گلگوں ہوگیا۔ اس لمحے وہ اتنی حسین لگی کہ میں اس کی تمام ترناراضگی اور لوگوں کی باتیں بھول بیٹھا۔ اس کا غصہ پھر ابھر آیا۔

"دیکھیں آپ پھر وہی حرکت کررہے ہیں۔ کیا یہ آنکھیں آپ کے قابو میں نہیں ہیں۔"

"اب تو نہ جانے کیا کچھ مزید قابو سے باہر ہوگیا ہے" میری

UrduPhoto.com

زبان بھی بے قابو ہو گئی۔

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے ڈاکٹر کسی لاعلاج مریض کو دیکھتا ہے اور اپنا اوور آل اُٹھا کر باہر کی طرف بڑھی۔

"پلیز پلیز، ذرا میری بات سنتی جائیں" میری عاجزی محسوس کر کے وہ رک گئی۔ ویسے بھی میں دروازے کے راستے میں کھڑا تھا مگر چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

"اگر آپ مجھ سے ناراض ہو کر گئیں تو میرا بُرا حال ہو جائے گا۔ دراصل اگر کوئی مجھ سے خفا ہو جائے تو میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ مجھے الرجی ہو جاتی ہے۔ چھینک کی جگہ کھانسی آتی ہے اور کھانسی کی جگہ چھینک، بھوک مر جاتی ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی اور عجیب عجیب خواب آتے ہیں جن میں شاہ جنات مجھے اپنی فرزندگی میں قبول کرنے کی دھمکی دیتے ہیں اور....."

"میرا خیال ہے کہ اگر آپ اپنی یہ باتیں کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھیں تو میں جاؤں، میری ڈیوٹی شروع ہونے والی ہے" وہ اپنے لبوں پر آنے والی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے بولی۔

"ضرور" میں خوشی سے بے قابو سا ہو گیا "میں آپ کی ڈیوٹی ختم ہونے کا انتظار کروں گا۔"

"میری ڈیوٹی رات بارہ بجے ختم ہو گی اور اس وقت میں کسی سے بھی کیس پر بھی نہیں مل سکتی" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"چلیں کوئی بات نہیں۔ کل میرے ساتھ لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کہاں؟ سن لائٹ یا آواری میں؟" وہ بدستور سنجیدہ تھی۔ میں نے سر کھجا کر اس کی طرف دیکھا۔ تو اس نے میری شرمندگی بھانپ لی۔ ایک ہاؤس جاب ڈاکٹر کی جیب بھلا یہ سب کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

"سوری! میں مذاق کر رہی تھی" وہ جلدی سے بولی "مگر پلیز میرا راستہ چھوڑیے! دیر ہو رہی ہے۔"

میں بوکھلا کر ایک طرف ہو گیا اور وہ باہر نکل گئی۔ عین اسی وقت ایک بی جمالو ٹائپ نرس اندر آئی۔ اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر زاہد آپ کو یاد کر رہے ہیں" وہ اپنی پتلی کراری آواز میں بولی۔

میں دل ہی دل میں... خیر کی دعا مانگتا وہاں سے چل پڑا۔ حالانکہ اس نرس کی زبان پر اس افسانے کو آنے سے روکنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا ہماری کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں میں اتحاد پیدا کرنا۔

○☆○

غزل نے میری بلیک اینڈ وائٹ زندگی کو کلر فل کر دیا۔ میری خوش مزاجی میں یکدم کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس پر میرے کولیگز نے دل جلے تبصرے کیے مگر میں انہیں نظرانداز کر گیا۔ صبح سویرے میں بڑے موڈ میں گنگناتا ڈیوٹی روم میں پہنچا تو وہاں غزل کے ساتھ طارق کو دیکھ کر میرا موڈ یک لخت آف ہو گیا۔ وہ خبیث یقیناً یہاں بھی میری کاٹ کے چکر میں تھا۔ یہ بات اس کی نظروں اور اس کی حرکتوں کے والہانہ انداز سے بخوبی ظاہر ہو رہی تھی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ غزل پر کالے بکرے کی طرح قربان ہوا جا رہا تھا۔

"ہیلو! کیسی ہیں آپ!" میں نے اسے نظرانداز کر کے غزل سے کہا۔

"تم ابھی تک آپ جناب پر چل رہے ہو" غزل کے بجائے طارق نے کہا "ارے یہ ہماری کولیگ ہے اور کولیگز میں ان تکلفات کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے! کیوں غزل درست کہا ناں۔"

"بالکل درست" وہ ذرا شوخی سے بولی "یہ صحیح کہہ رہا ہے۔"

"تو گویا وہ مردود اتنا آگے بڑھ چکا ہے" میں نے کھولتے ذہن سے سوچا اور اپنا اسٹیتھ اسکوپ سنبھالتا باہر نکل گیا۔ پیچھے سے غزل نے مجھے آواز دی مگر میں نے سنی ان سنی کر دی۔

میرے اندر رقابت کے آتش فشاں نے سر اٹھا لیا، جس کی تپش نے میری تمام خوش مزاجی بھاپ بنا کر اڑا دی۔ ساتھی ڈاکٹر میری اتنی سنجیدگی پر تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے یہ خوش اخلاقی اور مسکراہٹوں کا سارا اسٹاک کل خرچ کر چکا ہے اس لیے منحوس سی شکل بنانے پر مجبور ہے" یہ رائے سینئر ڈاکٹر شمیم مرزا کی تھی جنہیں ہم پیار سے پیٹھ پیچھے اچھن مرزا کہا کرتے تھے۔ اس بات نے مجھے منافقت کا بھرپور مظاہرہ شروع کرنے پر مجبور کر دیا مگر اندر وہی خزاں کا موسم چل رہا تھا۔

شام کو اسپتال کے کینٹین میں ایک سنسان میز پر میں اداس اُلّو کی طرح بیٹھا تھا۔ سامنے پڑی چائے دو مرتبہ ٹھنڈی ہو کر تین مرتبہ گرم ہو چکی تھی اور سینڈوچ اتنے باسی ہو چکے تھے کہ انہیں کھا لینے والے کا پیٹ میں جلا ہونا یقینی امر تھا۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر میرے ذہن میں ڈاکٹر غزل اور طارق عباس کے بارے میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ اس مردود کو یقیناً پتا چل گیا تھا کہ میں غزل کو پسند کرنے لگا ہوں چنانچہ وہ حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنے پہنچا تھا اور اب غزل کو ورغلانے میں مصروف تھا مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے میز پر مکا مار کر سوچا۔ پھر اپنے عین سامنے غزل کو موجود دیکھ بھونچکا رہ گیا۔ نہ جانے وہ کب آکر بیٹھ گئی تھی۔

"ہاں تو جناب کیا نہیں ہونے دیں گے؟" اس نے بڑی ادا سے کہنی میز پر ٹکا کر پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا کہ میں کیا ہونے دوں اور کیا نہیں" میں نے منہ بگاڑ کر کہا۔ اگرچہ اس کی ادا کی تپش نے میری ناراضگی کی برف کو پگھلانا شروع کر دیا تھا۔

"ناراضگی کی کوئی وجہ بھی تو ہو آخر" اگلی ادا زیادہ جان لیوا

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

تھی مگر میں جان بر ہو ہی گیا۔

"طارق عباس" میرا جواب بڑا مختصر اور میری حد تک جامع تھا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

"طارق۔" وہ تعجب سے بولی "اس سے آپ کی کیا مخالفت ہے۔"

"کیونکہ وہ میرا حریف ہے' ہر معاملے میں' بچپن سے' پڑھائی میں' کھیل میں' پروفیشن میں اور اب...." میں نے میز پر دوسرا مکا رسید کیا "وہ میرا رقیب بھی بن گیا ہے۔"

"پہلے تو آپ یہ مکے بازی بند کریں" وہ اطمینان سے بولی "ورنہ بہت جلد آپ کیفے کے باہر نظر آئیں گے اور جہاں تک رقابت کا معاملہ ہے تو اس کا حل بہت آسان ہے' آپ اس لڑکی سے پوچھ لیں کہ وہ کسے پسند کرتی ہے۔"

"مشورہ اچھا ہے۔ چلو اب تم یہ بتاؤ کہ میرا پروپوزل قبول کرتی ہو؟" پہلے تو وہ اس بے تکے اظہارِ محبت پر حیران ہوئی۔ پھر یہ جان کر مزید حیران ہوئی کہ وہ لڑکی وہی تو ہے۔

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ تم دونوں مجھ سے ہی...." وہ حیرت میں آپ جناب بھی بھول گئی۔

"ہاں' اب بتاؤ کہ کسے قبول کرتی ہو اور کسے رد کرتی ہو؟" میرے اس جملے پر وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے اپنا بیگ اٹھا کر چلی گئی۔

○☆○

اگلے چند دن میں گواچی گائے کی طرح اداس و پریشان پھرتا رہا۔ اتنا تو میں بھی سمجھ چکا تھا کہ غزل ناراض ہو چکی ہے مگر کیوں' یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو میں نے اسے اسپتال کی راہداری میں جا لیا۔

"راستہ چھوڑیں میرا' یہ شریفوں کا کام نہیں ہے۔"

"صحیح کہا تم نے' واقعی ڈاکٹری شریفوں کا کام نہیں ہے" میں نے ٹھنڈی آہ بھری "ویسے بائی دی وے میں ناراضگی کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں۔"

"میرا اور آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے کہ میں ناراض ہوں۔"

"رشتہ ہی تو بنانے کی کوشش کر رہا ہوں' اگر تم موقع دو۔"

"پلیز' یہ جگہ ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے" وہ میری ڈھٹائی سے پریشان ہو گئی۔

"تب پھر لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے' وہیں یہ باتیں بھی کر لیں گے۔"

"سوری میں کہیں نہیں جا رہی ہوں" وہ رکھائی سے بولی۔

"کوئی بات نہیں تب میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں' پہلے ہی پورے اسپتال میں بدنامی ہو رہی ہے۔"

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا" میں نے بڑے ترنم سے

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سچی کہانیاں

مرزا امجد بیگ کی یادداشتیں

شیطان صفت

سبز قدم

قانونی ہیر پھیر گیاں' عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات
زن' زر اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

ریٹائرڈ ڈی ایس پی ملک صفدر حیات کی ڈائری

دستِ انتقام

اسیرِ ہوس

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی پیشہ ورانہ زندگی کے چند کیسوں کی روداد
جرم و سزا کی وہ کہانیاں جو انسانی حرص و ہوس کا آئینہ ہیں

قیمت فی کتاب ۸۰ روپے۔ ڈاک خرچ ۱۰ روپے۔ چاروں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز ✿ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ـ رمضان چیمبرز
نزد دفتر اخبار جنگ' آئی آئی چندریگر روڈ' کراچی ـ ۷۴۲۰۰

کہا پھر اس کے چہرے کے بگڑتے زاویے دیکھ کر جلدی سے بولا "بندہ صرف دو گھڑی تم سے ملاقات چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے" وہ کچھ سوچ کر بولی "شام پانچ بجے لیو پرڈ میں۔ اب میرا راستہ چھوڑیئے۔" اس کے الفاظ نے مجھ پر طاری اداسی کی چادر کو کاٹ کر رکھ دیا۔

میں ٹھیک پانچ بجے تیار ہو کر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ غزل دس منٹ لیٹ آئی۔ وہ معمول سے زیادہ حسین لگ رہی تھی یا پھر شاید روٹھی محبوبہ زیادہ خوبصورت لگتی ہو۔

"پچھلے دس منٹ میں دس مرتبہ میرا دل بند ہوتے ہوتے بچا" میں نے شکوہ کیا۔

"مجھے کیوں بلایا ہے؟" میری بات کو نظر انداز کر کے اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"حال دل سنانے کے لیے اور یہ جاننے کے لیے حضور اتنی خفا کیوں ہیں۔ خادم سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی۔"

"غلطی آپ سے نہیں مجھ سے ہوئی ہے۔"

"اچھا" میں نے سر کھجایا "غلطی بھی آپ کی اور ناراض بھی آپ۔ آخر کون سی غلطی ہے۔"

"غلط شخص کو دل میں بسا لینے کی" اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

"یعنی تمہیں احساس ہو گیا" میں اچھل پڑا "طارق واقعی ایک بہت بڑا خبیث ہے۔"

"میں طارق کی بات نہیں کر رہی ہوں۔"

"پھر؟" میں نے احمقانہ انداز میں کہا "کیا کوئی اور بھی ہے؟"

"اگر پانچ دس اور بھی ہوں تب بھی تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا" وہ گویا پھٹ پڑی اور آنسو کسی پہاڑی چشمے کی طرح رواں ہو گئے۔

"اُف! یہ تم نے رونا کیوں شروع کر دیا؟" میں نے فوراً اپنا رومال اسے پیش کیا "اور یہ تم نے دس پانچ کی بات کیوں کی۔ کیا تم میرے ہاتھوں اتنے قتل کروانا چاہتی ہو۔"

"تم اور قتل!" وہ اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی "طارق کے حق میں تو تقریباً دست بردار ہی ہو گئے تھے۔" اس کا لہجہ طنز سے بھرپور تھا۔

"دیکھو کہیں تم اس وجہ سے تو خفا نہیں ہو گئی تھیں کہ میں نے فیصلہ تم پر چھوڑ دیا تھا؟" بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ "یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں اپنی نوزائیدہ محبت کی کوئی قربانی وغیرہ دینا چاہ رہا تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ تم آزادی سے فیصلہ کر لو۔ بغیر کسی دباؤ کے۔"

"اور اگر میں طارق کو پسند کر لیتی تب؟" کوچنے والے انداز میں بولی۔

"قبول تو مجھے یقین تھا کہ جس شخص کے ساتھ دس منٹ گزارنا دشوار ہے تم اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کی حماقت نہیں کرو گی اور بالفرض محال تم یہ حماقت کر بھی جاتیں تو میرے پاس کئی متبادل طریقے بھی موجود تھے۔ تمہیں اس خبیث سے دور رکھنے کے۔"

"مثلاً کیا؟" وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرائی۔

"میں اسے سائنائیڈ کا انجکشن دے دیتا یا دست آور گولیوں کی پوری شیشی... پلا دیتا یا پھر سرجیکل نائف سے اس کا پیٹ پھاڑ دیتا اور..."

"یہ سب تو وہ بھی کر سکتا ہے۔"

"مگر وہ ایک کام نہیں کر سکتا" میں نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ "وہ تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتا۔"

یہ سُن کر وہ تھوڑا شرمائی تھوڑا لجائی اور اپنے انگل بھر چوڑے دوپٹے کو رسی کی طرح انگلی پر لپیٹ کر بولی۔ "آپ ذرا آہستہ نہیں بول سکتے، سارے لوگ ہماری باتوں پر کان لگائے ہوئے ہیں۔"

"تمہارے انداز سے معلوم ہو رہا ہے کہ مجھے مجازی خدا کے عہدے کے لیے سلیکٹ کر لیا گیا ہے" میرے لہجے میں شوخی تھی "ڈیوٹی جوائن کب تک کر سکتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے اب میں چلتی ہوں کیونکہ آپ آؤٹ آف کنٹرول ہوتے جا رہے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ غصہ اتر جانے کے بعد وہ دوبارہ آپ جناب پر آ گئی تھی۔

"پلیز سارا وقت تو مسئلہ سلجھانے میں گزر گیا اور میں نے اتنی محنت سے جو عشقیہ ڈائیلاگ یاد کیے تھے ان میں سے ایک بھی بولنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ بڑا ظلم ہے" میں نے واویلا کیا۔

"ایسا کیجیے گا کہ یہ ڈائیلاگ آپ ڈاکٹر قیوم سے بول دیجیے گا" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"وہ یہاں کہاں؟" میں بوکھلا گیا۔ کیونکہ ڈیوٹی سے بھاگ کر آیا تھا۔ اس نے داخلے کے گیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ڈاکٹر صاحب تشریف لا رہے تھے اور خاموشی سے باہر جانے والے دروازے کی طرف کھسک گئی۔

اس سے قبل کہ میں بل ادا کر کے خاموشی سے کھسک لیتا، ڈاکٹر صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ سیدھے میرے پاس آ پہنچے۔

"کیوں ڈاکٹر فراز، آپ یہاں کیسے، آپ کو اس وقت ڈیوٹی پر ہونا چاہیے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" انہوں نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔ اور میں ٹھنڈی سانس لے کر صفائی میں بولے جانے والے جملے موزوں کرنے لگا۔ وہ جونیئر ڈاکٹرز میں جلاد کے نام سے بھی مشہور تھے۔

O☆O

اس کے بعد غزل میرے لیے غذا اور ہوا کی طرح ناگزیر ہو گئی۔ کیونکہ جب تک میں دن میں اسے درجن بار نہ دیکھ لوں چین ہی نہیں آتا تھا۔ یہی حال اس کا بھی تھا۔ میری کوشش ہوتی کہ ہم دونوں کی ڈیوٹی کے اوقات ساتھ ساتھ ہوں اور کبھی اسپتال

UrduPhoto.com

انتظامیہ ظالم سماج کا کردار ادا کرتے ہوئے ڈیوٹی کے اوقات مختلف کر دیتی تب بھی میں صرف اس کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے ڈبل ڈیوٹی کے لیے بھی تیار ہو جاتا۔

جلد ہی پورے اسپتال نے طارق سمیت یہ تسلیم کرلیا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ اگرچہ شروع میں طارق نے اپنی سی پوری کوششیں جاری رکھیں کہ میرا اور غزل کا ملاپ ممکن نہ ہو۔ اس نے غزل کو ورغلانے سے لے کر اسپتال میں ہم دونوں کے متعلق غلط افواہیں پھیلانے تک اپنی سی پوری کوشش کرلی۔ مگر بقول شاعر وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے کے مصداق اپنی شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا مگر جب بھی اس کا مجھ سے یا غزل سے سامنا ہوتا تو دلی کینہ ابھر کر اس کے چہرے کو مکروہ بنا دیتا۔ بہرحال ہم دونوں کو اس کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

وہ جلد ہی مجھے اپنے گھر والوں سے ملانے لے گئی۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے اسکول کے پرنسپل ہی اس کے والد ہیں۔ انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ غزل کے ساتھ آنے والا ڈاکٹر ہمارے اسکول کا سب سے ہونہار اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے" وہ بڑی گرمجوشی سے بولے۔

"رئیلی پاپا، یہ آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں؟" غزل خوشی سے بولی۔

"تو تمہارے خیال میں میں مذاق کر رہا ہوں" انہوں نے چشمے کے اوپر سے اسے گھورا اور یہ ان کا مخصوص اسٹائل تھا "ارے اس نے پورے اسکول میں ریکارڈ نمبر لیے تھے اس کا تو نام بھی اسکول کی گیلری میں لکھا ہے۔"

"سر آپ شرمندہ کر رہے ہیں ورنہ میں کس قابل ہوں۔ یہ سب آپ کی شفقت اور محنت کا ثمر ہے اور ماں باپ کی دعائیں ہیں جو میں آج اس مقام پر ہوں" میں نے انکساری دکھائی۔

"درست کہا تم نے" انہوں نے میری تائید کی

غزل چائے کے بہانے وہاں سے کھسک گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی اماں بھی آگئیں اور دونوں میاں بیوی نے مجھے مستقبل کے ہونہار داماد کی حیثیت سے پرکھنا شروع کر دیا۔ میں نے نہایت دیانت داری سے اپنے حالات اور آئندہ کے منصوبے ان کے گوش گزار کر دیے۔ انٹرویو کے اختتام پر مجھے قوی امید ہو گئی کہ مجھے سلیکٹ کر لیا جائے گا۔

دوسرے دن موقع پاتے ہی میں نے کل کے انٹرویو کا رزلٹ دریافت کیا تو غزل نے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ فتح کا نشان یعنی وی دکھایا۔ میں ایک زوردار نعرہ لگانے جا رہا تھا مگر اس نے پیشگی بھانپ کر ہاتھ میں پکڑا بسکٹ میرے منہ میں ٹھونس دیا۔

اس خوشی میں میں نے اسے ایک شاندار ریسٹورنٹ میں دعوت کی۔ وہاں روشنی خاصی کم تھی۔ چنانچہ میرا کھانا سوپ میں پڑی نوڈلز اٹھانے میں بار بار ناکام ہو رہا تھا، اور وہ اس پر مسلسل ہنس رہی تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی کوشش ترک کر دی۔ "میرا خیال ہے کہ میں اب اتی جان کو تمہارے گھر بھیج دوں" میں نے اس کے صبیح چہرے پر نظر جما کر کہا اور اس کی ہنسی کو یکدم بریک سا لگ گیا۔

"وہ کیوں؟" وہ صاف انجان بن کر بولی۔

"اس لیے کہ وہ انکل اور آنٹی کے سینے پر دھری ایک بھاری سِل اپنے ہاں منتقل کرلیں تاکہ وہ بے چارے بھی آزادی سے سانس لے سکیں" میں نے جل کر کہا۔

"جی نہیں، میں اپنے امی ابو پر بوجھ نہیں ہوں" وہ چڑ کر بولی۔

"اچھا تو پھر وہ اتنی مشکل سے سانس کیوں لے رہے تھے" میں نے مصنوعی تشویش کا مظاہرہ کیا "میرا خیال تھا کہ انہیں یہی روگ ہو سکتا ہے۔"

"جی نہیں، کسی خیال میں مت رہیے گا۔ ہاؤس جاب مکمل ہونے سے پہلے ایسی کوئی بات نہیں ہوگی" وہ اپنے کنگن سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"اچھا" میں نے مایوسی سے کہا "کم از کم منگنی تو ہو سکتی ہے۔"

"ہاں اس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے فریادی" وہ شاہانہ انداز میں بولی۔

"بس تو پھر یہ طے ہے کہ اس ہفتے کی مبارک ساعت کو والدہ صاحبہ تمہارے گھر میں ہوں گی اور اپنے مبارک ہاتھوں سے تمہارے اس حسین ہاتھ میں انگوٹھی پہنا رہی ہوں گی۔" میں نے حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔ "کاش یہ کام میں خود سر انجام دے سکتا" میں نے ایک سرد آہ بھری "دراصل اتی کچھ پرانے رسم و رواج کی قائل ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ شادی سے پہلے لڑکوں کو اپنی ہونے والی دلہن کو نہیں دیکھنا چاہیے۔"

○☆○

زلزلہ ایک بار پھر آیا جس نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔

"اوئے ڈاکٹر صاب اُٹھ جاؤ" "ابھی تم نے بھی پیشی بھگتانے جانا ہے" میں جو ایک آنکھ کھول کر قاسم دادا کو دیکھ رہا تھا۔ پیشی کا لفظ سنتے ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ رات دادا کو اس کی پیشی یاد دلاتے ہوئے میں اپنی پیشی کے بارے میں بھول ہی گیا تھا۔

ساڑھے چھ فٹ لمبا قاسم دادا شکل و صورت کے لحاظ سے خالص مکرانی تھا۔ اپنی "مخصوص" حیثیت کے باعث جیل میں اسے بہت سی رعایتیں غیر قانونی طور پر حاصل تھیں، اس کے پاس موبائل فون بھی تھا۔ وہ جب چاہتا باہر رابطہ قائم کرلیتا۔ اپنے گرگوں کو وہ اسی ذریعے سے کنٹرول کرتا تھا۔

ایک پورٹیبل ٹی وی اور وی سی آر بھی اس کے پاس تھا۔ فلمیں خود جیلر اسے مہیا کرتا تھا۔ کھانے میں اس کے لیے تینوں ٹائم اسپیشل چیزیں آتی تھیں۔ جب وہ نیا نیا آیا تھا تو مجھے کنکر بھری دال

UrduPhoto.com

اور اُبلی ہوئی سبزی کھاتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"اڑے تم اتنا بڑا ڈاکٹر ہے اور یہ کھاتا ہے۔ اڑے چھوکرے اے' ابھی روسٹ مرغی آرہا ہوگا' تم وہ ہمارے ساتھ کھائے گا" اس کے آنے سے پہلے ہی یہاں موجود دیگر قیدی اس کا اتنا ذکر کر چکے تھے کہ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔

"نہیں دادا مجھے وہ مرغی ہضم نہیں ہوگی" میں نے آہ بھر کر کہا۔

"کیا مطلب! کیا تمہارا پیٹ خراب ہے؟" انکار سُن کر وہ مزید حیران ہوا۔

"نہیں دادا' میرا ضمیر فی الوقت درست ہے۔ وہ مجھے یہ مرغی ہضم کرنے نہیں دے گا۔"

"اڑے تمہارا یہ الٹا سیدھا بات ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہے" وہ جھنجلا کر چُپ ہوگیا۔

بہر حال میں نے قاسم دادا کے لیے آنے والی چیزوں میں سے کوئی چیز قبول کرنے سے انکار کردیا۔ پہلے تو وہ تھوڑا ناراض ہوا پھر خود ہی سیٹ ہوگیا۔ دراصل وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی بات کی بھی زیادہ پروا نہیں کیا کرتے تھے۔ البتہ اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اس کی بدولت مجھے جیل کی مینوئل سہولیات بہتر انداز میں ملنے لگیں اور باہر سے میرے لیے آنے والا سامان بغیر پوسٹ مارٹم کے مجھ تک پہنچنے لگا۔ اس کی مدد سے میں اپنی ضرورت کی چیزیں باہر سے منگوا لیا کرتا تھا۔

قاسم دادا مجھ سے پہلے پیشی پر روانہ ہوگیا تھا۔ جاتے جاتے وہ مجھ سے بڑے معنی خیز لہجے میں بولا "ڈاکٹر آج شاید تیری رہائی کا دن ہو سکتا ہے' ذرا ہوشیار رہنا۔"

اس کی بات نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔ آج میری دوسری ہی پیشی تو تھی۔ جس میں میری ضمانت کی درخواست بھی دائر کی جانی تھی مگر وکیل نے ضمانت کے سلسلے میں پہلے ہی ناامیدی ظاہر کردی تھی۔

"کیس اتنا سنگین نہیں ہے عاصم میاں۔ مگر مخالف پارٹی بڑی تگڑی ہے اور جج بھی ان سے متاثر لگ رہا ہے لہٰذا زیادہ امید مت رکھو" وکیل عظیم الدین' والد صاحب کے دور پرے کے رشتے داروں میں شامل تھے۔ چنانچہ خون کا حق ادا کر رہے تھے۔

"چچا جان کیا امید بالکل بھی نہیں ہے؟" میں نے امید بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"ہے" وہ پان چباتے ہوئے بولے "اگر میں ان کے کسی زر خرید گواہ کو توڑنے میں کامیاب ہوگیا۔"

چنانچہ ابھی کا امکان تو کم ہو گیا تھا کہ دادا کا اشارہ یقیناً میری ضمانت کی طرف تو نہیں تھا پھر اس نے اتنا معنی خیز لہجہ کیوں اپنایا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ اس چکر میں الجھنے کے بجائے پیشی کی تیاری کروں۔ پیشی سے پہلے نہانے دھونے اور شیو کرنے کی اجازت جیل مینوئل میں تھی مگر حقیقت میں کم قیدیوں کو یہ سہولت ملتی تھی۔ قاسم دادا کی بدولت مجھے یہ سہولت بھی باآسانی میسر تھی۔

میری داڑھی خاصی بڑھ گئی تھی مگر میں نے شیو کرنے کے بجائے نہا لینا زیادہ بہتر سمجھا۔ ٹھیک نو بجے پیشی کے لیے گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ گاڑی میں میرے علاوہ چار اور ملزم بھی تھے۔ یہ چاروں جیل میں شیطان کی طرح مشہور تھے۔

ان میں مشہور زمزمہ ڈاکو اور اس کے اول' دوم اور سوم نائب شامل تھے۔ یہ چاروں بڑی محنت سے ڈاکے میں کمائی گئی رقم ایک مشہور رقاصہ کے قدموں میں لٹانے آئے تھے۔ ان کی بدقسمتی کہ ایس پی صاحب خود بہ نفسِ نفیس محفل میں موجود تھے۔ ان کی مزید بدقسمتی یہ کہ ان کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود ایس پی نے انہیں پہچان لیا۔ چنانچہ جب وہ ایک سنسنی خیز رات گزار کر صبح سویرے جھومتے ہوئے رقاصہ کی کوٹھی (کوٹھے پُرانی اصطلاح ہو چکی ہے) سے باہر نکلے تو چاروں طرف اسلحہ بدست سپاہیوں کو دیکھ کر ان کا نشہ ہرن ہوگیا۔

ایس پی کو ان خطرناک ڈاکوؤں کی گرفتاری پر گراں قدر انعام ملا مگر وہ اسے استعمال کرنے کے لیے زندہ نہ رہے۔ ایک صبح وہ اپنی رہائش گاہ سے روانہ ہوئے تو "نامعلوم" افراد انہیں ان کی سرکاری جیپ سمیت چھلنی کر گئے۔

چاروں ڈکیت جیل میں بھی اتنے ہی آرام سے رہ رہے تھے جتنے وہ اپنے گھروں میں رہ سکتے تھے۔ جیل کے نچلے عملے سے لے کر جیل سپرنٹنڈنٹ تک بغیر چون وچرا کیے ان کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔

اس پیشی میں ان کا فیصلہ سنایا جانا تھا اور ان کے کرتوت اور جرائم دیکھ کر یہ بات یقینی تھی کہ ان میں سے کسی کو پھانسی سے کم سزا نہیں ہوگی۔ یہ بات انہیں بھی معلوم تھی مگر وہ سارے راستے قہقہے لگاتے رہے۔ ایک دوسرے سے ہر طرح کا مذاق کرتے رہے اور ایک دوسرے کی ماں بہن ایک کرتے رہے۔

سپاہی بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک رہے اور صلے میں گولڈ لیف کے سگریٹ پیتے رہے۔ البتہ انہوں نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی جس پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

میرا نمبر پیشی میں تیسرا تھا۔ اس دوران میں ایڈووکیٹ چچا مجھ سے کیس پر تبادلۂ خیال کرتے رہے اور مجھے جج فرض کر کے زوردار (اپنی دانست میں) دلائل دیتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید غزل آئے گی مگر یہ آرزو آخر تک آرزو ہی رہی۔

حسبِ توقع جج نے میری ضمانت کی درخواست مسترد کردی۔ البتہ اس نے پولیس کی مزید ریمانڈ کی درخواست بھی مسترد کردی۔ اگلی تاریخ مہینے بھر بعد کی تھی۔ واپسی میں وہی خبیث صورت پھر میرے ہم سفر تھے۔ اب کے زیادہ نرالی بات یہ ہوئی کہ ان میں سے ایک

UrduPhoto.com

کی ہتھکڑی میرے ساتھ لگائی گئی یعنی ہم دونوں فی الوقت ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور تھے۔

واپسی کے وقت زمزمہ اینڈ کمپنی خاصی چپ چپ سی تھی۔ ان کی شگفتگی جو آتے وقت موجود تھی۔ اب مفقود نظر آرہی تھی۔ زمزمہ خاموشی سے ریلوے انجن کی طرح دھواں اگلنے میں مصروف تھا۔ جب کہ باقی تینوں بھی چپ چاپ سے تھے۔ میرے خیال میں ان کی اس حالت کی ذمے دار وہ سزائیں تھیں جو انہیں کورٹ میں سنائی گئی ہوں گی۔

تھوڑی دیر بعد جب وین ایک سنسان سے علاقے سے گزر رہی تھی۔ وہ چاروں یکدم چوکنا ہوگئے۔ زمزمہ نے اپنے برابر بیٹھے ہیڈ کانسٹیبل سے جھک کر کان میں کچھ کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر منہ سے کچھ بولا نہیں۔ سپاہیوں کے چہروں پر بھی بے چینی سی چھاگئی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

کچھ دیر بعد یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ وین چلتے چلتے رک گئی۔ اور باہر پہلے تو کچھ افراد کے بولنے کی آواز آئی۔ پھر یکدم فائرنگ شروع ہوگئی۔ فائر کسی پستول یا ریوالور سے کیے جارہے تھے۔ اچانک وین کا ٹائر دھماکے سے برسٹ ہوگیا اور وین ایک طرف جھک گئی۔ مجھے حیرت اندر بیٹھے سپاہیوں پر تھی جو یوں اطمینان سے بیٹھے تھے جیسے باہر گولیاں نہیں پٹاخے چل رہے ہوں۔ حتیٰ کہ انہوں نے گود میں رکھی رائفلوں کو ہاتھ میں اٹھانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

باہر فائرنگ رُک گئی اور کسی نے وین کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کانسٹیبل نے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پاکر دروازہ کھول دیا۔ باہر جو شخص کھڑا تھا وہ اس وقت ڈاکوؤں کے روایتی کاسٹیوم میں تھا۔ یعنی سیاہ ملیشیا کا سوٹ، سینے پر بھی کارتوسوں کی پیٹی اور ہاتھ میں کلاشنکوف ٹائپ کوئی گن۔ اس کے منہ پر ڈھاٹا بھی بندھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں کچھ اور حضرات بھی اسی "حلیے" میں موجود تھے۔

سب سے پہلے انہوں نے پولیس والوں کو غیر مسلح کیا اور پھر ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی بندھے ہونے کی وجہ سے مجبور تھا اور یہ تو میں نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ یہ ڈاکوؤں کے "فرار" کا ڈراما ہے۔ جس میں پولیس والے بھی برابر کے شریک ہیں۔ ایک پولیس والے نے جان دے کر انہیں گرفتار کروایا تھا۔ دوسرے کچھ مال لے کر فرار کروا رہے تھے۔

"میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا" میں نے نیچے اُترتے ہی کہا۔

"ان ہتھکڑیوں کی چابیاں کہاں ہیں؟" زمزمہ نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ جو وین میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"چابیاں تو انسپکٹر صاحب کے پاس تھیں" اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"حرام خور! تم سے اتنا نہیں ہوسکا کہ چابیاں ہی لے لیتے" وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔

"مجبوری ہے ڈاکٹر" پھر وہ بڑے مہذب لہجے میں مجھ سے بولا یعنی وہ مجھ سے واقف تھا۔ "ہم اپنی ہتھکڑی بھی نہیں کھول سکتے۔ تو تمہاری کیسے کھول سکتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو' ہتھکڑی کھلتے ہی ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

"نہیں" میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھ پر بھی فرار کا الزام لگ جائے گا اور میرا کیس خراب ہوجائے گا۔ تم اس گن سے فائر کرکے درمیان کی کڑی توڑ دو۔"

"استاد جلد ہی نکل لو ایسا نہ ہو کسی اور مصیبت میں پھنس جائیں" اس کا نائب اول جبار خان بے چینی سے بولا۔

"اس میں خطرہ ہے" زمزمہ میرے قریب آیا اور پھر آہستگی سے بولا "کیا تم ان پولیس والوں کے ہاتھوں مرنا چاہتے ہو۔ یہ کسی عینی گواہ کو نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی نکل چلو بعد میں جہاں کہو گے چھڑوا دوں گا۔" میں نے ایک لمحے کو صورت حال پر غور کیا اور پھر زمزمہ کی بات میں وزن محسوس کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈاکو اس دوران میں تمام پولیس والوں کو وین میں بند کرکے باہر سے کنڈی لگا چکے تھے۔ کچھ ہی دور ایک لینڈ روور کھڑی تھی۔ فوری طور پر ہم سب اس میں سوار ہوئے بلکہ لد گئے کیونکہ بندے زیادہ اور گنجائش کم تھی۔ جیپ نے فوراً ہی سڑک چھوڑ کر ایک ناہموار راستہ اختیار کیا۔ میری سمجھ میں صبح قاسم دادا کا کہا گیا فقرہ اب آرہا تھا۔ اسے یقیناً اس بارے میں سن گن مل گئی ہوگی۔ ویسے بھی وہ جیل کا سب سے باخبر بندہ تھا' جیلر سے بھی زیادہ مجھے یہ فکر بھی لاحق ہوگئی تھی کہ اس صورت حال کا اثر میرے کیس پر کیا پڑے گا۔ کیونکہ ان خطرناک مجرموں کے ساتھ فرار استغاثہ والوں کو بھرپور کمک فراہم کرے گا اور عین ممکن ہے کہ وہ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ اصل میں فرار میں ہوا تھا' نہ کہ ڈاکو۔ بہر حال اب تو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گاڑی کے باہر دیکھنے لگا۔

ایک سہانی شام میری اور غزل کی منگنی کی تقریب منعقد ہوئی اور وہ میری آفیشل منگیتر قرار پائی۔ اسے جیت کر مجھے یوں محسوس ہورہا تھا کہ میں نے دنیا فتح کرلی ہے مگر ہمارا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ملاقاتوں پر سرکاری پابندی عائد کردی گئی (سرکاری پابندی سے مراد ایسی پابندی ہے جس کی خلاف ورزی کرنا زیادہ مزے دار ہو) بہر حال ہم دونوں ہفتے عشرے میں کہیں چھپ چھپا کر مل ہی لیتے تھے۔

طارق' منگنی کے بعد ایک بار پھر حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے اندر کا ملال ابھر کر چہرے پر آجاتا تھا۔ اس کی گھٹیا حرکتیں بھی دوبارہ بڑھنے لگیں نتیجے میں اس سے میری ایک زوردار جھڑپ ہوگئی۔ اس نے سب کے سامنے امی ابو پر طنز کیا کہ

UrduPhoto.com

میں نرسوں کی اولاد ہوں۔ میں بھڑک اٹھا اور جواباً اسے خون چوسنے والی جونک قرار دیا۔ بہرحال اس کے بعد جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوتا تو ہماری آنکھوں سے لپکنے والے شعلوں کی تپش قریب کے افراد با آسانی محسوس کرلیتے تھے۔ وہ میرے خلاف زہر اگلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا مگر میں بات نہ بڑھنے کے خیال سے درگزر کر جاتا اور پھر ہاؤس جاب مکمل ہونے میں صرف مہینہ رہ گیا تھا اس کے بعد میری جان اس سے چھوٹ ہی جانی تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ پہلے ایف آر سی ایس اور پھر ہارٹ کے شعبے میں اسپیشلائز کروں گا۔ ان دنوں میری ڈیوٹی ہارٹ کے وارڈ میں تھی جن دنوں وہ واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے میں ڈاکٹر فراز اکبر سے جیل کا کچا قیدی نمبر ۳۳ بن گیا۔

"اس رات اپنی ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے میں نے میرا نامی ہارٹ پیشنٹ کو ایک مخصوص انجکشن لگایا جو ہارٹ بائی پاس کے آپریشن کے بعد دل کی دھڑکن کو متوازن رکھنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ اس دوا کی حساس نوعیت کے پیشِ نظر صرف ڈاکٹر ہی یہ انجکشن مریض کو دے سکتا ہے۔"

ڈیوٹی ختم ہوتے ہی میں گھر روانہ ہوگیا۔ کیونکہ آج امی نے میری پسندیدہ ڈش کوفتے بنائے تھے۔ کھانا وغیرہ کھا کر میں بستر پر لیٹا ہی تھا کہ اسپتال سے فون آیا کہ ایمرجنسی ہے فوراً آجاؤں۔ دوبارہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ کسی مریض کی حالت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے مجھے طلب کیا گیا ہے مگر وہاں تو چکر ہی دوسرا تھا۔ میرا کے کمرے کے سامنے نرسیں اور ڈاکٹر موجود تھے یہ سب نائٹ شفٹ والے تھے اور ان میں طارق بھی موجود تھا۔ اس نے بڑے پُراسرار انداز میں مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب آگئے۔" ایک نرس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی اعلان کیا اور سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔ مجھے بے چینی سی ہونے لگی کہ وہ اتنے عجیب انداز میں مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں۔

"کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں" میں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ اس پر نائٹ شفٹ کے انچارج ڈاکٹر زیدی نے میرے مدمقابل آکر بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"پیشنٹ روم نمبر ۴۸ از ڈیڈ" ان الفاظ نے مجھے دم بخود کردیا۔

"مگر کیسے جب میں آخری بار اسے دیکھ کر گیا تھا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی" الفاظ جیسے خود بخود میرے منہ سے پھسل گئے۔

"یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم اندر ڈاکٹر قیوم ہیں" اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اتنے میں ڈاکٹر قیوم باہر نکلے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گئے پھر مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرکے چل دیے۔ ان کے کمرے میں پہنچ کر میں کرسی پر ڈھیر سا ہوگیا اور وہ کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"عاصم تم نے انجکشن ۳۳ کس مقدار میں دیا تھا؟" انہوں نے اچانک سوال کیا۔

"فائیو ایم ایل سر" میں نے جواب دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ شاید ڈاکٹر قیوم مریضہ کی موت کو میری غفلت کا نتیجہ سمجھ رہے ہیں کیونکہ اس دوا کی ذرا سی زائد مقدار بھی مریض کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ بازار میں یہ انجکشن کسی اور نام سے ملتے ہیں مگر ہم اسے انجکشن ۳۳ کہتے ہیں۔ اس بنا پر یہ انجکشن نرس سے لگوانے کے بجائے میں نے خود لگایا تھا اور دوا بڑی احتیاط سے سرنج میں بھری تھی۔ میرے خدشات کی تصدیق ڈاکٹر قیوم نے کردی۔

"اس لڑکی کی موت زائد مقدار میں انجکشن دیے جانے کے باعث ہوئی ہے" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔

"سر میں نے خود بڑی احتیاط سے مقدار ناپ کر انجکشن دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں سر مجھے" میری آواز گلے میں پھنسنے سی لگی۔

"آئی نو عاصم یور آر اے گڈ ڈاکٹر۔ بٹ اٹ از اے فیکٹ شی ہیز ڈائیڈ" انہوں نے سنجیدگی سے کہا "اور میرا شبہ کم ہی غلط نکلتا ہے۔ اگر پوسٹ مارٹم نے میرے شبے کی تصدیق کردی تو ڈاکٹر تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ تمہارا کیریئر بھی ختم ہوسکتا ہے تمہیں سزا بھی ہوسکتی ہے۔"

"مگر میں بے گناہ ہوں سر" میں نے ملتجی لہجے میں کہا "میں نے اسے بالکل درست مقدار میں انجکشن دیا تھا اور سر اس بات کی تصدیق سسٹر فائزہ بھی کرسکتی ہے۔ وہ وہیں پر موجود تھی۔"

"اس نے یہ بات نوٹ نہیں کی تھی" انہوں نے نفی میں سرہلایا "پھر دس ایم ایل کی پوری شیشی خالی ہے۔ زائد دوا کہاں گئی ہے؟"

"سر میں بے قصور ہوں آپ چاہیں تو مجھے بچاسکتے ہیں۔" میری اس بات پر انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا اور زودرشتی سے کہا۔

"مجھے بھی یقین ہے کہ آپ بے قصور ہیں لہٰذا غلط بات کہہ کر میرے یقین کو جھٹلائیے مت۔"

میں خود کو چاروں طرف سے گھرا محسوس کررہا تھا۔ اگر یہ سازش تھی تو بڑی مکمل اور جامع تھی۔

صبح ہونے سے قبل ہی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی جس کے مطابق مریضہ کی موت کا سبب دل کی دھڑکن رک جانا تھا جو انجکشن ۳۳ کی زائد مقدار کے باعث بند ہوگیا تھا۔ اور جب سورج ...طلوع ہورہا تھا تو میں مقامی تھانے کی حوالات میں تھا۔

○☆○

بیل کی آواز سن کر میں اپنے خیالات کے سمندر سے باہر نکلا۔ گھنٹی موبائل فون کی تھی اور فون زمزمہ کے ہاتھ میں تھا۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس دوران میں گاڑی زیادہ تر ویران علاقوں سے گزر رہی تھی۔

"کیا بکتے ہو" زمزمہ فون پر بات کرتے ہوئے دہاڑا "اتنی

UrduPhoto.com

جلدی وہ وہاں کیسے پہنچ گئے۔ میں تم سب کی کھال کھینچ کر بھس بھردوں گا" اس نے خطرناک انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔

سب اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"گاڑی اپنے ٹھکانے پر لے چلو۔ مخبری ہوگئی ہے، اب عارضی ٹھکانے پر جانا خطرناک ہے۔ پولیس نے پورا علاقہ گھیر لیا ہے" اس نے صورت حال واضح کی۔

"مگر سردار ہمارے ساتھ باہر کا بندہ بھی تو ہے" اوّل نائب نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسے اپنا ٹھکانا دکھانا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس کا علاج بھی میرے پاس ہے" زمزمہ نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔

"کیا استاد؟" ایک بچہ جمورا نائب کے گرگے نے بے صبری سے اپنی رائفل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔

"فی الحال تو اس کی آنکھوں پر کچھ باندھ دو" اس نے ہدایت کی "باقی اپنے ٹھکانے پر چل کر فیصلہ کریں گے کہ اس کا کیا کرنا ہے" زمزمہ کا لہجہ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔

ایک ڈاکو نے بڑی مہارت سے میری آنکھوں پر اس طرح رومال باندھا کہ میرے لیے باہر تو کیا، کچھ بھی دیکھنا ممکن نہ رہا۔

مجھے اپنی عافیت خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں طارق کو منتخب کی ہوئی گالیوں سے نوازا اور پھر انھیں سو سے ضرب دے کر ان کا عذاب اسے بخش دیا۔ اگر ڈاکو اینڈ کو یہ محسوس کرتے کہ میں ان کے وجود کے لیے خطرے کا باعث ہوں تو وہ بلا تکلف مجھے اوپر ٹرانسفر کر دیتے۔ اور یہ سب اسی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

میری حالت برین ٹیومر کے مریض کی سی ہو رہی تھی جس کا ٹیومر کسی بھی وقت پھٹ کر اس کے انتقال کا باعث بن سکتا تھا۔ اس دوران میں گاڑی زیادہ ناہموار راستے سے گزر رہی تھی چنانچہ میں کبھی اوّل نائب پر گرتا اور کبھی دوم نائب پر اور کبھی وہ دونوں مجھ پر آن گرتے۔ چڑھائیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم بلندی کی سمت جا رہے ہیں۔ بڑے دھکے کھانے کے بعد آخر ہم زمزمہ ڈاکو کے ڈیرے پر پہنچ ہی گئے۔

پہلے تو وہاں پر مبارک سلامت کا شور اٹھا اور پھر گلے ملنے کا دور چلا۔ میرے ہتھکڑی پارٹنر سے بھی کئی افراد بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اس دوران میں وہ مجھے بھول گئے تھے۔ اس کے بعد وہ شاید اندر کی طرف چلے۔ میں بھی اندھوں کی طرح ان کے ساتھ ساتھ لگا رہا۔

"تم بھی بیٹھ جاؤ" میرے ساتھی نے ہتھکڑی کو جھٹکا مار کر کہا اور میں خود بخود بیٹھ گیا۔

"استاد پہلے تو اس کڑے سے مجھے نجات دلاؤ۔"

"نہیں پہلے میری پٹی کھولو ورنہ میں سچ مچ اندھا ہو جاؤں گا" میں نے کراہ کر کہا۔

کسی نے ایک جھٹکے سے رومال کھینچ لیا اور میری آنکھوں کے سامنے ترمرے سے ناچ کر رہ گئے۔ جب دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے نظر سامنے بیٹھے زمزمہ اور اس کے ساتھیوں پر پڑی۔ اکثر نئی صورتیں تھیں۔ اتنے میں ایک دُبلا سا مگر پھرتیلا شخص چابیوں کا گچھا اور تالے کھولنے کے دیگر اوزار اٹھائے ہوئے آیا۔ سب سے پہلے اس نے چابیاں آزمائیں۔ تیسری چابی لگانے پر نائب اوّل کے ہاتھ میں لگا تالا کھٹ سے کھل گیا۔ کھولنے والے نے داد طلب نظروں سے زمزمہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور پولیس اور ان کی ہتھکڑیوں کی شان میں ایک مختصر مگر ناقابلِ اشاعت قصیدہ پڑھا۔ حالانکہ وہ صرف پولیس کے تعاون سے ہی بچ کر یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ سب سے آخر میں مخنی سے شخص نے مجھے ہتھکڑی سے نجات دلائی۔

"دیکھو ڈاکٹر" زمزمہ نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا "اس ہتھکڑی سے تو بچ نکلنا ممکن ہے مگر ہماری گرفت میں آئے ہوئے بندے کو صرف موت ہی آزاد کرا سکتی ہے لہٰذا بھاگنے کا کوئی خیال دماغ کے کسی کونے میں کلبلا رہا ہے تو بہتر ہے کہ اسے نکال دو۔"

الفاظ اور دھمکی اگرچہ فلمی ٹائپ تھی مگر اس ماحول میں یہ نہایت سنگین لگی۔

"ابھی کچھ دن تم مہمان بن کر ہمارے ڈیرے پر رہو گے" وہ حتمی لہجے میں بولا "پھر مناسب موقع ملنے پر ہم تمھیں آزاد کر دیں گے۔"

ایک خدمت گار قسم کا بندہ مجھے لے کر مہمان خانے میں پہنچا جو درحقیقت کوٹھریوں کی ایک طویل قطار تھی۔ ان میں سے ایک کوٹھری میری حصے میں آئی۔ اندر ایک کھرے بان کی چارپائی تھی جس پر موٹا کھیس بچھا تھا۔ یہ کوٹھری کا اکلوتا فرنیچر تھا۔ اس کے علاوہ صرف ایک مٹکا اور ایک عدد پیتل کا گلاس تھا۔ روشنی کے لیے میرے ساتھ آنے والا ایک لالٹین لایا تھا۔ جو اس نے دیوار کے ساتھ لٹکا دی۔

"سائیں بیٹھو" ابھی میں تمہارے لیے کھانا لاتا ہوں" وہ بڑے ادب سے بولا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ تھکن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بمشکل دس منٹ بعد وہ ایک ٹرے میں کھانا لے آیا جو تندوری روٹیوں، آلو گوشت اور آم کے اچار پر مشتمل تھا۔ اس کھانے کو دیکھ کر میری بھوک جو حالات کے پیچ و خم میں گم ہو گئی تھی۔ چمک اٹھی اور میں یعنی ڈاکٹر فراز اپنے مرتبے اور مقام کو فراموش کر کے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانے کے بعد نیند کا شدید حملہ ہوا اور پھر دن بھر کی تھکن بھی تھی جس کی وجہ سے جسم آرام کا تقاضا کر رہا تھا۔ میں نے مٹکے میں سے پانی نکال کر پیا اور بستر پر گر کر

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

دنیا سے بے خبر ہو گیا۔

چونکہ میں نیند کے معاملے میں بہت پکا ہوں۔ لہٰذا یہاں بھی مجھے گھر اور جیل کی طرح جھنجوڑ کر بیدار کیا گیا۔ یہ وہی رات والا خادمِ خصوصی تھا۔

"سائیں سورج نکل آیا ہے۔ جلدی سے ناشتا کرلو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا" اس نے ٹرے کی طرف اشارہ کرکے کہا جس میں گھی میں تر بتر پراٹھوں کے علاوہ مکھن کا پیالہ اور ایک جہازی سائز مگ میں چائے بھی تھی۔

پہلے میں اس کی رہنمائی میں ایک غسل خانے تک گیا جو باہر سے انتہائی خستہ حال لگ رہا تھا مگر اس کے اندر میں ڈیلیو سی سسٹم دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

ادھر میں ناشتے سے فارغ ہوا۔ ادھر خادمِ خصوصی جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

"سائیں کوئی اور خدمت؟ کوئی اور چیز کی ضرورت ہو تو ہم کو بتاؤ؟"

"سب سے پہلے تو تم مجھے کوئی سادہ شلوار قمیص لادو تاکہ میں اس یونیفارم سے نجات حاصل کرسکوں" میں نے اپنے جیل کے کپڑوں کو دیکھ کر کہا۔ خادمِ خصوصی فوری طور پر اس نئے مشن پر روانہ ہو گیا اور چند لمحوں بعد ہی وہ کپڑوں کا ایک ڈھیر اُٹھائے واپس آیا۔

"لو سائیں" سائیں شاید اس کا تکیہ کلام تھا "ان میں سے جو تمہارے ناپ کا ہو پہن لو" اس نے کپڑے بستر پر ڈھیر کرتے ہوئے کہا۔ ان میں مختلف رنگوں کے اور مختلف سائز کے شلوار سوٹ شامل تھے۔ پتا نہیں یہ کہاں سے آئے تھے بہرحال میں نے کسی قدر اپنے ناپ کا ایک سیاہ رنگ کا سوٹ منتخب کرلیا۔

"سائیں اگر نہانا چاہو تو نہالو۔" اس نے میرے دل کی بات کہہ دی۔

نہانے کے دوران میں خادم کے بارے میں سوچتا رہا۔ اپنی مسکین سی شخصیت اور نرم خوئی کی وجہ سے وہ ان خون خوار ڈاکوؤں سے میل نہیں کھاتا تھا۔ نہ جانے اس کی کیا مجبوری ہوگی جو وہ ایسے لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر رہا تھا جن کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ موت کے ساتھ جن کی آنکھ مچولی چلتی رہتی ہے۔ یہی سوال میں نے اس سے کیا جب وہ مجھے دوپہر کا کھانا دینے آیا۔

چند لمحے تو وہ خاموش رہا پھر بولا "سائیں ابھی تو ہم مصروف ہے اوروں کو بھی کھانا دینا ہے۔ آپ آرام سے روٹی پانی کرو ہم فرصت ملتے ہی تمہارے پاس آجائے گا۔"

سہ پہر کو جب میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا تو وہ آگیا۔ پہلے تو اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کردیا کہ اس کا نام خادم بخش ہی ہے۔ پھر اس نے اپنی دکھ بھری کہانی کا آغاز کیا جو بڑی مختصر ثابت ہوئی۔

"سائیں میں چرواہا تھا۔ ایک دن ڈھور ڈنگر چراتے ہوئے غلطی سے اس علاقے میں آنکلا اور ڈاکوؤں نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ تو مجھے گولی مار رہے تھے مگر سردار زمزمہ نے مجھے بچالیا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ایک دفعہ زمزمہ پولیس سے بچ کر بھاگ رہا تھا۔ تو ہمارے علاقے میں آنکلا۔ اسے بڑی پیاس لگی تھی تو ہم نے بکری کا دودھ نکال کر اسے پلادیا۔ اس نے ہم کو روپے دینا چاہیے مگر ہم نے لینے سے انکار کردیا۔ بس اسی وجہ سے اس نے ہمارا جان بخشی کردیا۔ مگر ہمیں اپنے ڈیرے پر رکھ لیا۔ اب یہاں ہم سب کی خدمت کرتا ہے۔ کھانا دیتا ہے۔ کپڑے دھوتا ہے اور بھی بہت سارے کام کرتا ہے۔"

"کیا تمہیں اپنے گھر والے یاد نہیں آتے؟" میرے اس سوال پر اس کا چہرہ دکھی سا ہو گیا۔

"یاد کیوں نہیں آتے سائیں' ہمارا ماں ہے' بیوی ہے' دو پیارا پیارا حور کے مانند بیٹیاں ہے وہ ہم کو ہر وقت یاد آتا ہے سوتے میں بھی' جاگتے میں بھی۔ ویسے ہم ان سے ملنے جاتا ہے۔ ہمیں مہینے میں تین دن کا چھٹی ملتا ہے۔"

"زمزمہ کو تم پر اعتماد ہے؟"

"شروع شروع میں نہیں تھا۔ وہ ہمارے ساتھ اپنا بھی ایک آدمی بھیج دیتا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اعتبار آگیا۔ ویسے بھی ہم اس سے بچ کر کہاں جاتا۔ وہ ہمارا بیوی بچہ کو مروا دیتا۔"

"تم پولیس کے پاس جاسکتے تھے۔"

"نہیں سائیں" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "پولیس سے اس کی پکی یاری ہے۔ وہ الٹا ہم کو پکڑ کر اسے پیش کردیتی۔ زمزمہ دشمن کو بھی ایک بار معاف کرسکتا ہے پر غدار کے لیے اس کے پاس معافی نام کی کوئی شے نہیں ہے۔"

"تم تو یہاں ہوتے ہو' تمہارے گھر والے کیسے گزارا کرتے ہیں؟"

"سائیں ہم کو تنخواہ ملتی ہے" وہ پہلی بار مسکرایا "یہاں ہمارا کوئی خرچ نہیں ہے۔ ہم ساری تنخواہ گھر دے آتا ہے۔ زمزمہ ہم کو اتنا دیتا ہے کہ ہمارا گھر والا خوشحال ہو گیا ہے۔ پہلے ہم دوسروں کے مویشی چراتا تھا اب ہمارے پاس اپنا مویشی ہے۔ یہ جو ڈیرے پر تم دودھ دیکھتا ہے' یہ جو گوشت کھاتا ہے یہ ہمارے گلے سے آتا ہے۔"

"زمزمہ کا نام کچھ عجیب سا ہے' کیا یہ اس کا اصلی نام ہے؟"

"نہیں سائیں' زمزمہ تو لوگ اس کی دہشت کی وجہ سے کہتے ہیں۔ اس کا اصل نام شہباز ہے" وہ بولا۔

اتنے میں باہر سے کسی نے اس کو پکارا اور وہ جلدی سے اٹھ کر باہر لپکا۔ اور وہ سوال جو مجھے اصل میں پوچھنے چاہیے تھے زبان تلے ہی رہ گئے۔

UrduPhoto.com

○☆○

تھانے کے ایک علیحدہ کمرے میں غزل میرے سامنے تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ وہ جب سے آئی تھی مسلسل یہ شفاف موتی ضائع کر رہی تھی۔

"فراز! اب کیا ہوگا؟" پچھلے دس منٹ میں وہ کوئی تیسری مرتبہ یہ جملہ دُہرا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"کچھ نہیں ہوگا" میں نے تسلی دینے کی کوشش کی مگر الفاظ کا کھوکھلا پن صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت میرا دماغ ایسے کمپیوٹر کی طرح ہو گیا تھا جس کی بجلی بند کر دی گئی ہو اور وہ کام کرنے سے قاصر ہو۔

"میرے خیال میں اگر لڑکی کے ماں باپ سے مصالحت کی کوشش کی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا" یہ رائے ایڈووکیٹ چچا کی تھی۔ جو غزل کے برابر تشریف فرما پان کی جُگالی کر رہے تھے۔

"مگر کس بنیاد پر؟" میں نے انہیں سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"شرعی قانون میں یہ گنجائش ہے کہ قتل خطا کی صورت میں خون بہا ادا کر کے سزا سے بچا جا سکتا ہے۔"

"مگر میں نے یہ خطا نہیں کی ہے" میں نے احتجاج کیا۔

"قانون صرف شواہد دیکھتا ہے جو فی الوقت تمہارے خلاف جا رہے ہیں۔ انجکشن کی خالی شیشی پر صرف تمہاری انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ نرس کی گواہی کے مطابق تمہارے انجکشن لگانے کے بعد کوئی اور متوفیہ کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ نرس کا یہ بیان بھی ریکارڈ پر آ چکا ہے کہ اس نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ تم نے سرنج میں کس مقدار میں دوا بھری ہے۔ یہ ایک پلس پوائنٹ تھا جو ضائع ہو گیا۔"

"اگر وہ لوگ خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو اندازاً یہ رقم کتنی ہوگی؟"

"یہ تمہاری اور ان کی حیثیت پر منحصر ہے" انہوں نے کندھے اچکائے "اگر تم نے خون بہا دینے کی پیشکش کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں اپنے جرم کا اقرار ہے۔"

"اقبالِ جرم!" میں اچھل پڑا۔ "یہ تو میں مر کر بھی نہیں کروں گا۔ میں سزا سے تو بچ جاؤں گا مگر میرا پریکٹس لائسنس چھن جائے گا۔ اور پھر میں کروں گا کیا۔"

"دیکھو میاں یہ کیس خاصا پیچیدہ ہے۔ تمہاری صفائی میں صرف تمہارا بیان ہے جبکہ خود اسپتال والے اس معاملے میں استغاثہ کے ہمنوا بن رہے ہیں" چچا ایڈووکیٹ میز پر طبلہ بجاتے ہوئے بولے "ان حالات میں بہتر یہی ہے کہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان قبول کر لو۔ بصورتِ دیگر سزا ہونے کی صورت میں تمہارا لائسنس ویسے بھی منسوخ ہو جائے گا۔" ان کے الفاظ کی سنگینی نے مجھے دہلا دیا مگر ان حالات میں شاید اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ڈاکٹری میرے لیے صرف ایک پیشہ ہی نہ تھا، وہ خواب بھی تھا جو میرے والدین نے اس وقت دیکھا تھا جب میں نے اس دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ اگرچہ شروع میں یہ میرے لیے اتنا کشش انگیز نہ تھا مگر اب جب یہ خواب بکھرنے کو تھا تب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ بالکل ایسے جیسے مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

"وکیل صاحب آپ کا ٹائم ختم ہو گیا ہے۔ صرف بی بی دس منٹ اور بیٹھ سکتی ہیں" ایک کرخت صورت کانسٹیبل نے کمرے میں جھانک کر اپنی کرخت آواز میں الارم بجایا۔

"اچھا میاں" چچا اپنا بستہ سنبھال کر اُٹھ کھڑے ہوئے "حوصلہ مت ہارنا ہم تمہارا... کیس آخر تک لڑیں گے۔ سیشن کورٹ سے سپریم کورٹ تک اللہ حافظ۔"

چچا ایڈووکیٹ کی موجودگی میں غزل کو صرف میں کن انکھیوں سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ ان کے جاتے ہی پوری بے باکی سے گھورنے لگا۔ میری نظریں محسوس کر کے وہ تھوڑی سی محجوب ہو گئی۔

"یوں کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"شانِ قدرت، حورِ جنت، حسینۂ عالم وغیرہ وغیرہ۔"

"دیکھو وقت کم ہے" وہ سنجیدہ ہو گئی "لہٰذا اس وقت میں صرف وہ بات کروں گی۔ جس کے لیے یہاں آئی ہوں۔ طارق مجھ سے ملا تھا۔"

"کیا! کیوں ملا تھا؟" میں جو اس کے وجود میں کھویا ہوا تھا چونک اُٹھا۔

"پہلے تو اپنی روایتی خباثت کا مظاہرہ کرتا رہا کہ اب فراز تو گیا۔ دس بارہ سال سے پہلے اس کی واپسی مشکل ہے اور ویسے بھی ایک مجرم تمہارے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا میں تمہارا کوئی متبادل تلاش کر لوں پھر آخر میں خود کو متبادل کے طور پر پیش کر دیا۔"

"اس خبیث کو یہ سب کچھ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی" میں نے میز پر مُکا مارا جس پر باہر کھڑے کرخت صورت کانسٹیبل نے اندر جھانکا۔

"سرکاری املاک کو زدوکوب کر رہے ہو" وہ اپنی کرخت آواز میں غرایا اور غائب ہو گیا۔

"تم نے یہ سب سُن کیسے لیا" میں نے پھر مُکا میز پر رسید کرنا چاہا مگر بروقت خود کو روک لیا۔

"وہ اپنی مدد کی پیشکش کر رہا تھا۔"

"میری مدد... اور وہ بھی طارق!" میں کراہنے کے انداز میں ہنسا "حالانکہ مجھے سو فی صد یقین ہے کہ مجھے پھنسانے میں اس کا ہاتھ ہے" یہ سُن کر وہ اچھل پڑی۔

"طارق کا ہاتھ مگر کیسے اور کیوں؟" اس نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"کیسے" میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اگر یہ پتا ہوتا تو

UrduPhoto.com

میں یہاں کیوں بیٹھا ہوتا۔ ہم دونوں اس وقت کسی اچھے سے ہوٹل میں بیٹھے مستقبل کے پلان بنا رہے ہوتے اور جہاں تک تعلق ہے کیوں کا تو تم اچھی طرح واقف ہو۔ وہ یہ برداشت کرہی نہیں سکتا کہ میں کسی بھی معاملے میں اس کے مقابلے میں کامیاب ہوں اور خاص طور سے جب سے ہماری منگنی ہوئی ہے وہ باؤلا سا ہو گیا ہے۔"

"یعنی رقابت میں وہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ یہ سنگین کام کر بیٹھا" وہ بے یقینی کے انداز میں بولی۔

"میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ یقیناً موقع کی تاک میں ہوگا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ چکر اس کے ذہن میں کب سے تھا۔ بہرحال یہ کام اسی کا ہو سکتا ہے۔"

"تب مجھے بتاؤ کہ وہ کس طرح پکڑا جا سکتا ہے۔"

"مشکل ہے" اسے پھنسانا .... فی الوقت ممکن نہیں ہے" پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا "سنو غزل' تم نرس فائزہ کو چیک کرو کیونکہ اسے ملائے بغیر طارق یہ کام کرہی نہیں سکتا تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو" وہ بھی پُرجوش لہجے میں بولی "اگر فائزہ اپنا بیان بدل دے تو تم بے گناہ ثابت ہو سکتے ہو۔"

"مگر یہ سارا کام رازداری سے کرنا۔ اگر طارق کو بھنک بھی مل گئی تو وہ اس کو بھی راستے سے ہٹا سکتا ہے۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا اور رخصت ہو گئی۔

O☆O

مجھے زمزمہ کے قیدخانے میں آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور اس عرصے میں سوائے خادم بخش کے کوئی صورت میرے ملاحظے میں نہ آئی تھی۔ آخر ایک دن میں پھٹ پڑا۔

"میں تنگ آگیا ہوں' آخر کب تک یہاں قید رہوں گا" خادم جو میرے لئے کنگ سائز مگ میں بھاپ اُڑاتی ہوئی چائے لے کر آیا تھا' میری بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔

"توبہ کرو سائیں' تم قیدی کہاں ہے۔ تم تو ہمارا مہمان ہے" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا

"ہنہ' مہمان جسے اپنے کمرے سے باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ہے" میں نے تلخی سے کہا۔

"سائیں کیا ہو گیا ہے تمہیں' ابھی تو تم نے اتنے اچھے طریقے سے ہم کو چائے لانے کا کہا تھا۔ ابھی ہم چائے لایا ہے تو تم غصہ ہو رہا ہے۔ لو تم یہ چائے پیو ہم تمہیں یہ معاملہ سمجھاتا ہے۔" وہ مجھے چائے کا مگ تھماتے ہوئے بولا۔ "تم کو باہر جانے سے اس لئے روکتا ہے کہ یہ تمہارے مفاد میں ہے جتنا تم ڈیرے کے بارے میں کم واقف ہوگا۔ اتنا ہی تم محفوظ رہے گا۔ دیکھو ابھی سردار کو پتا ہے کہ تم ڈیرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا وہ جب چاہے تمہیں چھوڑ سکتا ہے لیکن اگر تم دیکھ لو کہ ہمارا ڈیرا کہاں ہے۔ تب سردار تم کو چھوڑنا بھی چاہے تب بھی نہیں چھوڑ سکے گا۔ اس کا ساتھی نہیں چھوڑنے دے گا" اس بظاہر بیوقوف سے شخص نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔

"لیکن سردار چاہتا کیا ہے؟" میں نے نسبتاً نرم لہجے میں کہا "کم از کم مجھ سے مل تو لے۔"

"سائیں ہم تمہارا پیغام سردار تک پہنچا دے گا' آگے اس کا مرضی۔"

"سنو خادم" مجھے نیا خیال آیا "ڈیرے پر اخبار آتے ہیں؟"

"ہاں سائیں اکثر آتے رہتے ہیں۔"

"تب دیکھو اگر پچھلے دنوں کے اخبار ہیں تو لے آؤ۔"

"سائیں مجھے سردار سے اجازت لینا ہوگی" وہ تذبذب سے بولا۔

"تو لے لو نا۔"

"ٹھیک ہے ہم ابھی جاتا ہے" وہ اٹھتا ہوا بولا۔

میں کمبل اپنے گرد لپیٹ کر بیٹھ گیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ ایک تو سردی کا موسم تھا اور پھر یہ علاقہ بھی شاید پہاڑی تھا اس لئے شدت کی ٹھنڈ تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اخباروں کا بنڈل اٹھائے چلا آیا۔ میں نے بے تابی سے بنڈل کھولا' اس میں گزشتہ چھ روز کے اخبار تھے۔ پہلے میں نے وہ اخبار لیا جو ہمارے "فرار" کے اگلے دن کا تھا۔ سرخی پر نظر پڑتے ہی میرا دل ڈوب سا گیا۔ سرخی تھی۔

"عدالت سے جیل لے جائے جانے والے مجرم فرار ہو گئے۔" نیچے زمزمہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ میرا بھی نام شامل تھا یعنی میں بھی مفروروں میں شامل تھا۔ اگلے دن کے اخبارات کی خبریں بھی کچھ مختلف نہیں تھیں اور انہوں نے گھوڑے گدھے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا تھا۔

ایک حیرت انگیز خبر یہ تھی کہ پولیس وین پر ڈاکوؤں کے حملے میں تین پولیس والے "شدید زخمی" ہو گئے تھے جب کہ کم از کم میرے سامنے کسی کو خراش بھی نہیں آئی تھی۔ بہرحال یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ مجھے زبردستی "پانچواں" مفرور بنا دیا گیا تھا۔ آخری اخبار کی سرخی نے جو گزشتہ روز کا تھا' میرا خون خشک کر دیا۔ کیوں کہ ہم پانچوں مفروروں کی گرفتاری پر حکومت نے دس لاکھ روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا تھا' زندہ یا مُردہ' پولیس مقابلے میں اپنی وفات حسرت آیات کا تصور کر کے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

اسی شام کو زمزمہ نے مجھے اپنے خاص کمرے میں طلب کر لیا۔ وہاں اس کے ساتھ چند اور بھی ڈاکو حضرات موجود تھے۔ زمزمہ نے مجھے دیکھتے ہی ایک طویل قہقہہ لگایا۔

"ڈاکٹر اب تم پر بھی انعام لگ گیا۔ یعنی تم ایک معزز ڈاکو بن

UrduPhoto.com

گیا ہے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی عزت پر" میں نے بے خوفی سے کہا "تم یہ بتاؤ کہ مجھے کب چھوڑ رہے ہو۔"

"اے" اوّل نائب نے غرا کر کہا "سردار سے ایسے بات کرنے والوں کی زبان کاٹ دی جاتی ہے۔"

"تم زبان کی بات کرتے ہو' یہاں گردن کٹتی نظر آرہی ہے" میں نے بھی غرا کر کہا۔

"خوب" ذمزمہ نے مزید ایک قہقہہ لگایا "جبار خان یہ تم سے ڈرے گا نہیں لہٰذا تم بات مت کرو۔ ویسے بھی یہ ہمارا مہمان ہے" پھر مجھ سے کہا "ڈاکٹر تم فکر مت کرو ہم کوشش کررہے ہیں کہ تمہیں اس معاملے سے الگ ہی رکھیں" پھر وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "اسی لئے ہم نے حکومت سے تمہارا تاوان مانگا ہے۔"

"تاوان" میں چکرا گیا "یعنی اب میں مغوی ہوں۔"

"اور یہی تاثر ہم حکومت کو دینا چاہتے ہیں" وہ پُرخیال انداز میں بولا۔

O☆O

ذمزمہ سے ملاقات کے بعد میری اُمیدیں پھر سے تروتازہ ہوگئی تھیں۔ مجھے یقین سا تھا کہ حکومت چاہے میرا تاوان ادا کرے یا نہ کرے مگر میری بے گناہی ضرور تسلیم کرے گی۔ مگر ہم جو سوچتے ہیں' ویسا ہوتا نہیں ہے اور اسی کا نام قدرت ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا ہے۔"

ذمزمہ سے میری ملاقات کو ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ پولیس مقابلے میں اس کے مارے جانے کی خبر آگئی۔

"کیا بکتے ہو خادم" میں نے اس کا کندھا پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ خود بھی خاصا حواس باختہ نظر آرہا تھا۔ "کب' کیسے کہاں ماردیا؟"

"سائیں! سردار اپنی بیوی سے ملنے گیا تھا وہاں مخبری ہوگئی اور پولیس نے اسے گھیر لیا مگر وہ زندہ ان کے ہاتھ نہیں آیا" خادم بھرائی ہوئی آواز میں روداد سُنا گیا۔

مجھے اپنی ٹانگیں بے جان سی محسوس ہونے لگیں اور میں دھپ سے بستر پر بیٹھ گیا۔ ذمزمہ اس وقت زمین پر خدا کے بعد میرا واحد سہارا تھا جو مجھے اس دلدل سے نکال سکتا تھا مگر موت کی دلدل سے خود نہ بچ سکا۔ شام تک میں اچھا خاصا قنوطی ہوچکا تھا۔ شام کو جب خادم آیا تو میں نے ڈیرے کی صورت حال دریافت کی۔

"سائیں' تمام لوگوں نے جبار خان کو نیا سردار منتخب کرلیا ہے" اس نے میرے خدشات پر مایوسی کی ایک مہر ثبت کرتے ہوئے کہا۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ میرے لئے دل میں اچھے خیالات نہیں رکھتا اور اس کا اظہار اس کی کینہ پرور سی آنکھوں سے بخوبی ہوجاتا تھا۔ خادم بخش بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔

"سائیں مجھے آپ کی جان خطرے میں لگتا ہے" وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا "جبار خان پہلے بھی سردار کو تمہارے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔"

جبار خان کے سردار بن جانے کے بعد مجھے اپنے انجام کی فکر لگ گئی تھی اور غالب امکان یہی تھا کہ وہ میرا قصہ پاک کرنے کا فیصلہ کرے گا اور باقی اراکین گروہ اس کی حمایت کریں گے۔ سوائے خادم بخش کے جو ڈیرے پر شاید میرا واحد ہمدرد تھا۔

"خادم تم میرے لئے کیا کرسکتے ہو؟" میرے اس سوال پر اس نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکائے باہر نکل گیا۔ ظاہر ہے ایک معمولی سے خدمت گار میں اتنی جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے آقا سے اختلاف کرسکے۔ میں تھکے تھکے انداز میں بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ اب موت مجھے اپنے سر پر ناچتی محسوس ہورہی تھی۔ یہاں سے فرار بھی ناممکن سا تھا کیونکہ "مہمانوں" کے لئے مختص "مہمان خانے" کے بعد ایک دالان تھا جس کے بعد ایک طویل برآمدہ پھر وہ کمرے شروع ہوجاتے تھے جہاں ڈاکو حضرت قیام کرتے تھے۔ اس سے آگے مجھے نہیں معلوم کہ کیا تھا۔ بہرحال ڈیرے کے چاروں کونوں پر زمین سے بیس پچیس فٹ بلند مینارے بنے ہوئے تھے۔ جہاں مسلح افراد چوبیس گھنٹے موجود رہتے تھے۔ برآمدے میں بھی ہمہ وقت دو تین پہرے دار موجود رہتے تھے جو "مہمانوں" پر نظر رکھا کرتے تھے۔ مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوٹھریوں کی اس قطار میں کچھ اور لوگ بھی ان کمروں میں "آباد" ہیں مگر وہ کون ہیں اور کس لئے ہیں یہ معلوم نہ ہوسکا۔

بہرحال میں نے خود کو آنے والے سنگین حالات کے لئے تیار کرلیا۔ خادم اسی طرح دن میں کئی بار آتا رہا...... کبھی کھانا دینے' کبھی چائے دینے' کبھی ضروریات دریافت کرنے مگر اس نے منہ سے ایک لفظ بھی فالتو نہیں نکالا۔ اس کے انداز سے بھی یہی معلوم ہورہا تھا کہ اس نے مجھے میری تقدیر کے حوالے کردیا ہے۔

یہ ذمزمہ کے مارے جانے کے دوسرے دن کی بات ہے۔ جب مجھے رات کا کھانا کھا کر لیٹے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے مگر نیند آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں سوچوں میں غلطاں تھا کہ دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد دروازہ بڑی آہستگی سے کھلنے لگا۔ میں لالٹین بجھا چکا تھا۔ اس لئے کچھ نظر تو نہیں آرہا تھا مگر ہلکی سی چرچراہٹ دروازہ کھلنے کی خبر دے رہی تھی۔

میرے دل کی دھڑکن اس عاشق کی طرح تیز ہوگئی جو پہلی بار اپنی محبوبہ سے مل رہا ہو۔

دروازہ کھلتے ہی چاند کی ہلکی روشنی اندر در آئی جس کا بڑا حصّہ اس سائے نے روک لیا تھا جو دروازے پر نظر آیا تھا۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ اندر تھا اور بڑی آہستگی سے دروازہ بند ہورہا تھا مگر اس دوران میں' میں اس کے ہاتھ میں کوئی چمکدار شے دیکھ چکا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ خاموشی سے فرش پر اُتر جاؤں مگر پھر یہ خیال رد کردیا کیونکہ میری

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

چارپائی کی چرچراہٹ اسے بتا دیتی کہ میں ہوشیار ہوں۔ اس عرصے میں وہ قدم بہ قدم چارپائی کی طرف بڑھنے لگا۔

"تو فراز بیٹا' امید ہے کہ کچھ ہی دیر بعد تم خدا کے روبرو اپنے اعمالوں کا حساب دے رہے ہو گے" میں نے دل میں کہا۔ وہ اتنا قریب آ چکا تھا کہ اب آرام سے وار کر دیتا مگر اس نے وار کرنے کے بجائے اندازے سے میرے جسم کو چھوا تو ٹانگ ہاتھ میں آئی۔ پھر وہ بڑی دبی دبی آواز میں میرا نام لینے لگا۔

"فراز سائیں' فراز سائیں اٹھئے" ظاہر ہے یہ خادم تھا مگر رات کے اس پہر میں!

"کیا بات ہے' کون! خادم" میں نے غنودگی کی اداکاری کی مگر آواز آہستہ ہی رکھی۔

"سائیں خاموشی سے اُٹھ جائیں اور غور سے میری بات سُنیں۔ سائیں آپ کے بارے میں فیصلہ ہو گیا ہے۔ کل یہ آپ کو ادھر جنگل میں لے جا کر مار دیں گے" اس کا لہجہ بڑا سادہ مگر الفاظ بڑے خوفناک تھے۔

چٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ روشنی کی ایک باریک کرن جگمگائی۔ یہ تارچ تھی پنسل سائز جو خادم کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک عجیب سا ہتھیار تھا جو کلہاڑی' درانتی اور پھاوڑے کا مرکب لگ رہا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔

"ہم نے خود سُنا اپنے کانوں سے' جبار خان نے یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"کیا تم آدھی رات کو یہ خبر سُنانے آئے ہو؟" میں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

"نہیں سائیں ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہاری ہر طرح سے مدد کرے گا۔ ابھی ہم تم کو یہاں سے فرار کرائے گا" رہائی کے مژدے نے جیسے جسم میں بجلی سی دوڑا دی۔

"وہ کیسے؟" میں نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"اُدھر جو غسل خانہ ہے۔ اس کی دیوار میں ایک جگہ صرف کچی مٹی ہے' پتھر نہیں ہے۔ تم اس کی مدد سے وہ دیوار توڑ سکتا ہے" اس نے مخلوط النسل ہتھیار کی طرف اشارہ کیا۔

"تو پھر چلو' دیر کس بات کی ہے؟" میں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

"سائیں یہ اتنا آسان نہیں ہے" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "ابھی پہرے دار ہوشیار ہیں ذرا سی آواز سن کر بھی وہ ادھر دوڑے آئیں گے۔"

"پھر میں دیوار کیسے کھودوں گا۔ کتنی احتیاط کر لو آواز کچھ نہ کچھ تو آئے گی" میں نے الجھن سے کہا۔

"سائیں تم ذرا تھوڑا صبر کرو" اس نے تسلی دی "ابھی تھوڑا وقت باقی ہے۔"

"اچھا اس کے بعد کیا ہو گا؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"سائیں یہاں رات ایک بجے کے بعد پہاڑی جھینگر بولنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے شور میں کھدائی کی آواز دب جائے گی" اور میں اس بے وقوف نظر آنے والے شخص کی ذہانت کا ایک بار پھر قائل ہو گیا۔

"دیوار کتنی موٹی ہے اور اس کی دوسری طرف کیا ہے؟"

"سائیں دیوار دو فٹ کے قریب موٹی ہے اور دوسری طرف جھاڑیاں ہیں جس کے بعد ایک چھوٹا سا میدان ہے اور پھر اونچی نیچی پہاڑیاں ہیں۔ اگر تم ان پہاڑیوں کو عبور کر گئے تو بچ جاؤ گے کیونکہ یہ لوگ تمہیں دوسری سمت میں تلاش کریں گے" وہ شاید دم لینے کے لئے رُکا "سائیں بس تم چپ یہاں بیٹھے رہو۔ ہم ابھی آتا ہے۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے بے خیالی میں اس کا بازو پکڑ لیا۔

"ہم ابھی آپ کے لئے کچھ سامان لے کر آتا ہے جو بعد میں کام آئے گا" اس نے اپنا بازو چھڑایا اور تارچ بند کر کے اندھیرے میں رینگ گیا۔ ہلکی سی چرچراہٹ گونجی پھر ایک سناٹا سا پھیل گیا۔ اسے واپسی میں بمشکل دس منٹ لگے مگر مجھے ایسا لگا جیسے سال گزر گیا ہو۔ واپسی کی خبر بھی ہلکی سی چرچراہٹ نے دی۔ دروازہ بند کر کے اس نے تارچ روشن کی۔ اس کے پاس ایک عدد تھیلا تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" میں نے سرگوشی میں دریافت کیا۔

"کچھ کھانے کا سامان ہے' خشک روٹی اور بھنا ہوا گوشت۔ ایک دو وقت کام آئے گا۔ ایک چاقو ہے راستے میں کوئی شاخ کاٹ کر ڈنڈا بنا لینا۔ ادھر گیدڑ اور لکڑ بھگے بہت ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار بھیڑیے بھی نکل آتے ہیں۔ ڈنڈا حفاظت کے کام آئے گا۔"

"خادم میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا" میں نے جذباتی ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایسا کوئی بات نہیں ہے سائیں۔ آج ہم تمہارے کام آیا ہے کل کوئی ہمارے کام آئے گا" اس نے بڑی سادگی سے فلسفۂ زندگی بیان کر دیا۔

اسی اثنا میں خادم کی پیش گوئی کے عین مطابق جھینگروں نے اپنی نائٹ میوزک کا آغاز کر دیا۔ بلاشبہ اتنا شور ہو رہا تھا کہ میں اس معمولی اوزار کے بجائے کدال سے بھی کام لیتا تو کسی کو خبر نہ ہوتی۔ خادم نے آہستہ سے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ ہم دونوں دبے پاؤں چلتے ہوئے باہر نکلے۔ راہداری میں اگرچہ ہلکی سی روشنی تھی جو چاندنی کے انعکاس کا نتیجہ تھی مگر باہر سے دیکھ لئے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

UrduPhoto.com

غسل خانے میں گھس کر خادم نے دروازہ بند کیا اور ٹارچ روشن کرلی پھر اس نے مشرقی کونے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

"سائیں یہاں..... میں نے نشان لگادیا ہے۔ آپ کھودنا شروع کرو۔ میں باہر دیکھتا ہوں اگر کوئی آگیا تو میں خبردار کردوں گا۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ٹارچ تھما کر باہر نکل گیا۔

میں نے ٹارچ کی روشنی میں اس جگہ کا بغور معائنہ کیا مگر مجھے کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی۔ بہرحال میں نے اللہ کا نام لے کر اپنا ہتھیار سنبھالا اور دیوار پر ضربیں لگانے لگا۔ اوپری پلاسٹر خاصا سخت تھا کیونکہ توڑنے میں بڑی دشواری ہوئی مگر پھر کام آسان ہوگیا۔ اس حصے میں پتھر کے بجائے کچی مٹی سے دیوار اٹھائی گئی تھی اور اس کا فائدہ میں اٹھانے والا تھا۔

آسانی کے باوجود سوراخ کرنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ وقت بہت قیمتی تھا۔ اس دوران میں خادم کئی بار آکر کام کا معائنہ کرگیا۔ بالآخر سوراخ اتنا بڑا ہوگیا کہ میں کوشش کرکے دوسری طرف نکل سکتا تھا۔

باہر نکلنے سے پہلے میں نے خادم کو گلے لگا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر رینگ کر باہر نکل گیا۔ اس نے اندر سے مجھے تھیلا پکڑادیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق مجھے میدان عبور کرنے تک بڑا محتاط رہنا تھا کیونکہ چاندنی میں واچ ٹاورز سے دیکھ لئے جانے کا خطرہ بہرحال موجود تھا۔

میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا بلکہ رینگتا ہوا جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا ہر گزرتے لمحے ڈیرے سے دور ہوتا جارہا تھا۔ اگرچہ آزادی کا احساس ہورہا تھا مگر ہر لمحے یہ بھی دھڑکا لگا تھا کہ نہ جانے کب میرے فرار کا علم ہوجائے اور وہ شکاری کتوں کی طرح میرے پیچھے لگ جائیں۔

آخر کار انہی خیالات کے بھنور میں پھنسا میں ڈینجر زون یعنی میدان عبور کرہی گیا۔ اب اگرچہ خطرے کی حدود سے تو باہر نکل آیا تھا مگر پہاڑی علاقہ شروع ہوتے ہی چاند بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا۔ اندھیرے میں یہاں سفر کرنا خطرناک ہوسکتا تھا اور رکنے میں بھی عافیت نہیں تھی۔ مجبوراً ٹارچ نکال کر روشن کی اور آگے بڑھنے لگا۔

علاقہ خاصا ناہموار اور پتھریلا تھا چنانچہ اوسطاً ہر دس منٹ میں ایک دفعہ ضرور گرتا تھا۔ محض دو گھنٹے بعد جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں درد نہ ہورہا ہو۔ میں پہلے بھی کوئی نازک ٹائپ صحت مند انسان نہ تھا پھر جیل میں گزارے ہوئے عرصے میں مزید کمزور ہوگیا تھا۔ اور اب چلتے چلتے چول چول ڈھیلی ہوگئی تھی مگر رکنے کا مطلب موت بھی ہوسکتا تھا اس لئے دل پر جبر کرکے چلتا رہا۔ صبح کاذب پھیلتے پھیلتے تھکن نے میرے پورے وجود کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا تھا۔ قدم رکھتا کہیں اور پڑتا کہیں تھا۔ آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں اور پلکیں منوں وزنی محسوس ہو رہی تھیں۔ مسلسل چلنے سے سردی کا احساس بھی کم ہوگیا تھا۔

ایک مرتبہ جب تقریباً سو فٹ گہری کھائی میں گرتے گرتے بچا تب احساس ہوا کہ اب میں ڈاکوؤں کی رینج سے تو شاید باہر آگیا ہوں مگر اسی طرح چلتا رہا تو کسی کھائی میں گر کر جان سے ہاتھ دھونے کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹنا تو لازمی ہیں۔ جس کے بعد نہیں کہا جاسکتا کہ مجھ تک پہلے ڈاکو پہنچیں گے یا بھیڑیے، بہرحال نتیجہ تو ایک ہی نکلنا تھا۔

اس وقت میں ایک نسبتاً کم اونچے مگر زیادہ گہرے پہاڑی سلسلے کی ڈھلان اتر رہا تھا۔ آرام کرنے کی شدید خواہش کے باوجود شاید آرام میری قسمت میں نہ تھا۔ کیونکہ ہوا کے دوش پر لہراتی ایک مانوس آواز سنائی دے رہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد مجھ پر یہ واضح ہوگیا تھا کہ کچھ گھوڑے دوڑ رہے ہیں اور غالب امکان یہی تھا کہ ان کی پشت پر ڈاکو حضرات ہوں گے جو میری تلاش میں نکلے ہوں گے۔ بدحواس ہوکر میں نے چھپنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر عجیب احمقانہ سا پہاڑی علاقہ تھا جہاں چھپنے کی جگہیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کسی کھائی میں اترنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ راستہ خطرناک تھا اور پھر اگر گھڑ سوار اس طرف آنکلتے تو کھائیوں میں مجھے باآسانی تلاش کرسکتے تھے۔ چنانچہ عافیت اسی میں تھی کہ دوڑ لگاؤں۔ دوڑتے ہوئے ہر لمحے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ڈاکو سر پر آنے ہی والے ہیں۔

اگرچہ اپنی دانست میں تو میں بھاگ رہا تھا مگر عملاً چہل قدمی کررہا تھا۔ اس دوران میں ٹھوکر کھا کر چند نئے زخموں کا اضافہ بھی کرچکا تھا۔ راستے میں آنے والے چھوٹے بڑے پتھر ہرڈلز کا کام کررہے تھے۔ البتہ گرنے کے فرائض ان کے بجائے میں انجام دے رہا تھا۔ اس ریس کا اختتام یوں ہوا کہ میں جس پتھر سے آخری مرتبہ ٹھوکر کھا کر گرا بدقسمتی سے اس کے آگے بھی ایک پتھر موجود تھا اس سے میرا سر جا ٹکرایا۔ چند لمحے آنکھوں تلے اندھیرا چھایا رہا۔ پھر کچھ آتش بازی سی ہوئی۔ ڈوبتے ذہن سے میں نے قریب آتی ٹاپوں کی آواز سنی اور پھر بلیک آؤٹ ہوگیا۔

○☆○

جب فلکیات داں اپنے سائنسی آلات کی مدد سے خلا سے سگنل وصول کرتے ہیں اس وقت ان میں اصل آواز کے ساتھ بے پناہ شور بھی ہوتا ہے پھر وہ اس شور کو ختم کرنے کے لئے کچھ خاص آلات استعمال کرتے ہیں تب کہیں جاکر اصل چیز سننے کو ملتی ہے۔ بالکل ایسا ہی شور میرے دونوں کان وصول کررہے تھے جن کے پس منظر میں ملی جلی انسانی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پھر جیسے جیسے دماغ نے کام کرنا شروع کیا شور کم ہونے لگا اور آخر کار انسانی آواز بالکل واضح ہوگئی۔

"بھائی کیا یہ مرگیا ہے؟" ایک نسبتاً بیگانہ آواز نے دریافت کیا۔

UrduPhoto.com

"احمق دیکھ نہیں رہے یہ سانس لے رہا ہے" دوسری آواز نے پہلی آواز کو ڈپٹا "یہ زخمی ہے اسی وجہ سے بے ہوش ہے۔"

"اس پر پانی ڈالو۔ بابا بھی کہتے ہیں کہ بے ہوش آدمی کے منہ پر پانی چھڑکو تو وہ ہوش میں آجاتا ہے" پہلی آواز نے مشورہ دیا۔

"پیارے بچوں اس کی ضرورت نہیں ہے میں ہوش میں ہوں" میں نے دردناک آواز میں کہا۔

آنکھیں کھولنے پر نظر قریب بیٹھے دونوں لڑکوں پر پڑی۔ قریب ہی ان کے گھوڑے کھڑے تھے جن کی وجہ سے میں ڈاکوؤں کے شبے میں گرفتار ہو گیا تھا اور اس حال کو پہنچا۔ چھوٹے لڑکے کی عمر قریباً دس سال اور بڑے کی تیرہ چودہ سال کے قریب تھی۔

"تم کون ہو کہاں سے آئے ہو؟" بڑے لڑکے نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"فی الوقت میں زخمی ہوں اور مجھے مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔ کیا کوئی بڑا تمہارے ساتھ ہے۔"

"بابا ہیں" بڑے لڑکے نے سوچ کر کہا "مگر تمہیں ان کے پاس جانے کے لئے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ہمارے بابا تمہارے زخموں کی مرہم پٹی کر دیں گے" چھوٹے نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔

"تم گھوڑے پر بیٹھ سکتے ہو؟" بڑے نے دریافت کیا۔

"ہاں بشرطیکہ گھوڑے شرافت سے چل سکتے ہوں" میں نے انہیں خبردار کیا "دراصل مجھے پہلے کبھی گھوڑے پر بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"میرے رستم سے بہترین گھوڑا پورے علاقے میں نہیں ہے" بڑے نے بڑے فخر سے کہا۔

"مگر میرے راجا سے ریس میں ہار گیا تھا" چھوٹے نے فوراً اختلاف کیا۔

میں نے سب سے پہلے اپنے تھیلے کو تلاش کیا مگر وہ قریب میں کہیں نظر نہیں آیا شاید بھاگنے کے دوران کسی کھائی میں گر گیا تھا۔ اس دوران میں بڑا لڑکا گھوڑے کی راسیں تھامے تھامے منتظر تھا کہ میں اس پر سوار ہو جاؤں۔ تھیلے سے مایوس ہو کر میں گھوڑے کی طرف بڑھا جو کچھ اچھی نظروں سے میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے اس پر اناڑیوں کی طرح سوار ہوا اور دوسری سائیڈ گرتے گرتے بچا۔ میں نے کھسیا کر دونوں کو دیکھا اور یہ دیکھ کر تو پانی پانی ہو گیا کہ چھوٹا اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ لگتا تھا کہ وہ پیدا ہی گھوڑے کی پشت پر ہوا ہے۔ بڑے لڑکے کے گھوڑے پر میں سوار تھا۔ اس لئے وہ اس کی لگام پکڑ کر پیدل چلنے لگا۔

"تمہارے نام کیا ہیں؟" میرے اس سوال پر چھوٹے نے میری طرف دیکھا اور فوراً کہا۔

"پہلے آپ اپنا نام بتائیں؟"

"میرا نام" میں گڑبڑا گیا "میرا نام کہاں، میرا نام ایاز ہے" میں نے نام دانستہ غلط بتایا۔

"وہ جو محمود بادشاہ کا غلام تھا" چھوٹے نے پھر ٹوکنا لگایا۔

"احمق" بڑے نے فوراً ڈانٹنے کا فرض ادا کیا "وہ کب کا مر چکا ہے۔"

"میرا نام ذیشان ہے اور بابا پیار سے شانی کہتے ہیں" اس نے ڈانٹ کو نظر انداز کر کے کہا

"اور غصے میں شیطان کہتے ہیں" بڑے نے لقمہ دیا "میرا نام کامران ہے اور پیار سے مجھے کامی کہتے ہیں۔"

"اور بابا جب ناراض ہوں تو اسے کما کہتے ہیں" چھوٹے نے فوراً بدلہ اتارا۔ اس پر بڑے نے نظروں ہی نظروں میں اسے دھمکی دی کہ بعد میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ دونوں اگرچہ اس جنگل نما علاقے کے رہنے والے تھے مگر ان کے انداز اور زبان میں شائستگی تھی۔ دیہاتی پن کہیں سے محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے چہروں پر علم کی روشنی تھی جو عموماً گاؤں کے ان پڑھ بچوں کے چہروں پر نظر نہیں آتی۔

پہاڑی ڈھلان ختم ہوتے ہی سامنے ایک وسیع و عریض میدان آگیا جو گھاس سے بنا پڑا تھا۔

"گھر اور کتنی دور ہے؟" میرے سوال پر کامی نے دور درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں درختوں کے پیچھے ہمارا گھر اور فارم ہے۔"

"بابا گھوڑے پالتے ہیں، دور دور سے لوگ ان سے گھوڑے خریدنے آتے ہیں" چھوٹے نے انکشاف کیا۔

تو یہ تھا ان کی گھڑسواری کا راز۔ اسی اثنا میں شانی اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا درختوں میں غائب ہو گیا۔ غالباً وہ اپنے بابا کو اطلاع دینے گیا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو لکڑی کے بنے ہوئے ایک منزلہ گھر کے سامنے وہ ایک طویل قامت شخص کے ساتھ کھڑا بڑے جوش و خروش سے باتیں کر رہا تھا۔ ظاہر ہے میرے ہی بارے میں بتا رہا ہوگا۔

کامی نے گھوڑا اس کے پاس لے جا کر کھڑا کیا۔ طویل قامت شخص نے بغور میرا جائزہ لیا اور یہی کام میں نے بھی کیا۔ وہ جوانی اور بڑھاپے کے بین بین تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی وہ اس دوراہے پر موجود تھا یعنی اس کا جسم مضبوط اور اعضا ٹھوس تھے جب کہ چہرہ باوقار اور دنیاوی تجربات کا آئینہ دار نظر آتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے اترنے میں مدد دی اور سہارا دے کر اندر لے جانے لگا۔

"مجھے فرحان علی راؤ کہتے ہیں جناب ایاز عرف ڈاکٹر فراز صاحب۔"

یہ الفاظ گو کہ اس نے بڑی آہستگی سے کہے تھے مگر مجھے توپ کے گولے کی طرح آکر لگے۔ آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا اور میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اگر وہ سنبھال نہ لیتا تو شاید ایک نئے زخم کا اضافہ ہو جاتا۔

UrduPhoto.com

"آرام سے لیٹ جاؤ" وہ مجھے ایک کمرے میں لے آیا اور بستر پر لٹا دیا "میں ابھی فرسٹ ایڈ کا سامان لے کر آتا ہوں" وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔

میرے اندر ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ جس نے عارضی طور پر جسمانی تکلیف کو بھی بُھلا دیا تھا۔ یہ شخص فرمان علی راؤ مجھے اتنی آسانی سے کیسے پہچان گیا۔ جب کہ اس وقت جو حُلیہ میرا ہو رہا تھا کوئی قریبی شناسا بھی مجھے جوگی سے لے کر فقیر تک کچھ بھی سمجھ سکتا تھا مگر ڈاکٹر فراز کی حیثیت سے میری شناخت ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور تھی۔

فرمان علی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ بکس تھا، اس کے پیچھے اس کا بیٹا کامی ایک ڈونگا اور ایک تولیا لئے ہوئے آ رہا تھا۔ فرمان نے پہلے میری قمیص اُتاری اور اسفنج کی مدد سے گرم پانی سے میرا جسم صاف کرنے لگا۔ پانی میں شامل ڈیٹول زخموں میں مرچوں کی طرح لگ رہا تھا۔ میں دانت بھینچ کر درد برداشت کرتا رہا۔

صفائی سے فارغ ہو کر اس نے زخموں کی ڈریسنگ کی۔ اور پھر مجھے پہننے کے لئے ایک صاف ستھرا کرتہ شلوار دے کر باہر چلا گیا۔ ابھی میں انہیں پہن کر بیٹھا ہی تھا کہ چھوٹا لڑکا شانی ایک ٹرے پکڑے نمودار ہوا۔ ٹرے میں ایک مگ سائز پیالہ تھا جس میں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ چکن سوپ کی خوشبو محسوس کرتے ہی بھوک میرے اندر کسی درندے کی طرح انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔

"بابا نے کہا ہے کہ یہ سوپ پی لیں" اس نے ٹیپ کی طرح بابا کا حکم سُنایا۔

میں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور سوپ کے گرم ہونے کی پروا کیے بغیر ہی بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں پیالہ صاف ہو گیا۔ پیٹ اگرچہ کسی حد تک بھر گیا تھا مگر اشتہا باقی تھی اس لئے جب اس نے اور سوپ لانے کو کہا تو سر بے اختیار اقرار میں ہل گیا۔

دوسرا پیالہ میں نے ذرا تہذیب سے پیا اور اس دوران میں موجودہ اور آنے والی صورت حال پر غور کرتا رہا جو میرے حق میں کچھ زیادہ اچھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سوپ پی کر مجھ پر غنودگی سی چھانے لگی۔ ایک تو گزشتہ رات کی بھاگ دوڑ اور کوہ پیمائی کی تھکن اور پھر چکن سوپ پیٹ بھر کر پینے کے بعد نیند آنا تعجب خیز نہ تھا مگر میں ابھی جاگنا چاہتا تھا۔ البتہ نیند سے لڑنے کی جب میری تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے سوپ میں کچھ ملا کر دیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں آخری سوچ یہ تھی کہ دھوکا ہو گیا اور پھر میں اتھاہ تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔

❁❁❁

اس دفعہ شعور کی دنیا میں آتے ہوئے میرے کانوں نے خلا کی نشریات وصول نہیں کیں بلکہ کوئی آواز نہ تھی۔ جسم و ذہن حیرت انگیز طور پر ہلکے محسوس ہو رہے تھے۔ کمرے میں جلتی لائٹ سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ رات ہو چکی ہے۔ زخموں کی شاید نئی ڈریسنگ کی گئی تھی۔ ان میں تکلیف بھی صبح کی نسبت خاصی کم تھی۔

ابھی میں اٹھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ چھوٹے نے دروازے سے جھانکا اور شاید اپنے باپ کو بتانے چلا گیا۔ کچھ دیر میں فرمان علی کمرے میں موجود تھا۔ اس نے پہلے کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح میری نبض چیک کی پھر کرسی گھسیٹ کر بستر کے قریب بیٹھ گیا۔

"فرمان صاحب، حکومت کا یہ نافرمان بندہ کب تک دوبارہ اپنے صحیح مقام پر پہنچ جائے گا۔" کامران کی موجودگی کی وجہ سے میں نے مبہم مگر خوشگوار لہجے میں کہا۔

فرمان علی نے آنکھوں سے لڑکے کو جانے کا اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔

"یہ شبہ آپ کو کیوں کر ہوا کہ میں آپ کو گرفتار کروا سکتا ہوں؟"

"وہ یوں کہ آپ میرے خیال میں وہ ہیں نہیں جو نظر آتے ہیں۔ پھر آپ نے مجھے دیکھتے ہی شناخت کر لیا تھا جب کہ اس حلیے میں شاید میرے ماں باپ بھی مجھے نہ پہچان پاتے۔"

"صحیح کہا آپ نے میری ایک اور حیثیت بھی ہے مگر کیا؟ اس سے آپ کو سروکار نہیں ہونا چاہیے۔" وہ مسکرایا مگر اس کی آنکھیں سپاٹ رہیں "اصل مسئلہ آپ کا ہے۔ ویسے ڈاکوؤں کی قید سے آپ کیسے نکلے؟"

"اور میں یہ سب کچھ آپ کو کیوں بتاؤں؟" میں نے اسے آزمایا۔

"اس لئے کہ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"مثلاً کیسی مدد؟"

"یہ تو میں تب ہی بتا سکوں گا جب آپ مجھے کچھ بتائیں گے۔"

میں یہ سوچنے میں مصروف ہو گیا کہ فرمان علی کو کتنا کچھ بتانا مناسب رہے گا۔ عین ممکن ہے اس کے ڈاکوؤں سے روابط ہوں۔ اس ویران علاقے میں تن تنہا کوئی شخص اپنے بچوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا جب کہ ڈاکوؤں کا ڈیرا بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میری کشمکش دیکھ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز نکالی۔

"میرا خیال ہے یہ آپ کی تشفی کر سکتی ہے" اس نے وہ چیز مجھے تھمادی۔

یہ ایک کارڈ تھا جس کی رو سے فرمان علی انٹیلی جنس کا کارکن ثابت ہوتا تھا۔ اس کی تصویر بھی کارڈ پر تھی۔

"میں آپ کو سب کچھ الف سے لے کر ی تک بتادوں گا" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مگر پہلے آپ میرے چند سوالوں کے جواب دیں۔"

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

"اب ہم سے بھی سوال کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "خیر پوچھیں۔"

"آپ اس علاقے میں کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ تو خیر میں اپنی بیوی کو بھی نہیں بتا سکتا مگر یوں سمجھ لیں کہ یہ میرے سرکاری فرائض میں شامل ہے" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"آپ کی فیملی کہاں ہے؟"

"میرے بیوی بچے شہر میں رہتے ہیں۔ میرے دونوں بیٹے جن سے تم مل چکے ہو یہاں پر چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔ ویسے بھی میرا ارادہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اسی سیٹ اپ کو برقرار رکھوں گا اور فیملی کو یہیں بلا لوں گا۔"

"آپ نے مجھے پہچانا کیسے اور یہ کیسے کہا کہ میں ڈاکوؤں کی قید میں تھا۔"

"برخوردار ہماری لائن میں بندے کو باز جیسی آنکھ اور کمپیوٹر جیسے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہاری تصاویر اخبار میں چھپی تھیں۔ پھر مجھے یہ بھی پتا ہے کہ یہاں سے ڈاکوؤں کا ٹھکانا زیادہ دور نہیں ہے۔ تمہارا حلیہ اور گھوڑوں کو دیکھ کر بھاگنا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ تم ڈاکوؤں کی قید سے فرار ہوئے ہو" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"خیر اب جو پوچھنا ہے پوچھ لیں۔"

"صرف یہ کہ شروع سے اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے بالکل سچ سچ بتا دو۔ اگر تم بے گناہ ہو تو یہ میرا وعدہ ہے کہ سزا صرف اصل مجرم کو ملے گی۔"

اس کے لہجے میں نہ معلوم کیا تھا کہ میں نے اپنی داستان جو فرفر شروع کی تو اگلے دو ڈھائی گھنٹے میں جزئیات تک اس کے کانوں میں انڈیل دیں۔ وہ بڑی توجہ سے سب کچھ سنتا رہا۔ درمیان میں چند سوال بھی کیے۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر" اس نے مجھے تھپکی دی "اب تم آرام کرو، سب مسائل میرے لیے چھوڑ دو۔"

"مگر آپ یہ سب میرے لیے کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے تذبذب سے دریافت کیا۔

چند لمحے وہ سوچتا رہا پھر یکدم مسکرا کر بولا۔

"صرف اس لیے کہ ہمارے ملک میں ڈاکٹروں کی ویسے ہی بہت قلت ہے خاص کر اچھے ڈاکٹرز کی۔" اس کے جاتے ہی کامی اور شانی نے اندر جھانکا۔

"انکل ہم آ سکتے ہیں؟"

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ میں ویسے ہی بور ہو رہا تھا۔"

"بابا کر رہے تھے؟" کامی نے پوچھا۔

"میں بتاؤں انکل بابا کو لگا کہ کامی آپ کو بور کر رہا تھا" چھوٹے نے دھمکی دی۔

"ارے بھئی لڑنے کی کوئی بات نہیں ہے" میں نے ہنستے ہوئے چھوٹے کو اپنے پاس بٹھالیا۔

"اب ذرا انکل کو اپنے بارے میں بتاؤ" میرا اتنا کہنا تھا کہ شانی کی زبان سپر سونک رفتار سے چل پڑی۔ اپنی تعلیم سے لے کر دوستوں اور ان کے مشاغل تک نہایت تفصیل سے سنانا شروع کر دیا۔ پھر کامی نے اپنے بارے میں بتایا اور یوں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔

"انکل میرا خیال ہے کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ صبح سے آپ نے کچھ نہیں کھایا" کامی اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ اس کا مطلب سمجھ کر میں بھی ہنس پڑا۔

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں زور و شور سے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ زور میرا تھا کھانے پر اور شور ان دونوں کا تھا جس میں نوے فیصد حصہ شانی کا تھا۔ وہ غضب کا باتونی تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بچوں" فرمان علی اندر آتا ہوا بولا "اُف مجھے کتنی زبردست بھوک لگی ہے۔" وہ کھانا دیکھ کر بولا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

"ہوں مزہ آگیا۔ آج کس نے کیا کام کیا؟" وہ منہ چلاتے ہوئے بولا۔

"ابو کھانا میں نے بنایا ہے" کامی جلدی سے بولا۔

"اور بابا پیاز میں نے کاٹی ہے" شانی نے فخریہ انداز میں کہا۔

"اور تم نے کیا کیا؟" فرمان علی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں یہ کھا رہا ہوں" میں نے مسکین سی شکل بنا کر کہا اور سب ہنس پڑے۔ اسی طرح ہنستے بولتے طعام کا کام تمام کیا گیا۔ پھر دونوں لڑکے برتن اٹھا کر لے گئے۔

"میں نے بات کی ہے تمہارے کیس سے متعلق" وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بولا "میرے باس نے کہا ہے کہ وہ جلد ہی اس سلسلے میں تحقیقات کا آغاز کریں گے۔"

"اور جب تک یہ اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ جاتا، مجھے یہیں رہنا ہوگا؟"

"ضروری نہیں ہے" اس نے ایک گہرا کش لیا "مگر ان حالات میں جب پولیس نے تمہیں اشتہاری ملزم قرار دیا ہے بہتر یہی ہے کہ یہیں رہو۔"

"اصل میں میں غزل کی وجہ سے پریشان ہوں۔"

"کیوں اسے کس سے خطرہ ہو سکتا ہے؟" اس نے بغور مجھے دیکھا۔

"طارق سے، وہ کمینہ شخص خود کو پھنستے دیکھ کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"تمہیں طارق کے مجرم ہونے کا اتنا یقین کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"مگر اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے یقین کی نہیں بلکہ ثبوت

UrduPhoto.com

کی ضرورت ہوگی۔"

"ثبوت تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔"

"وہ تو ہم تلاش کرلیں گے" وہ مسکرایا "مگر اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا۔"

"کیا آپ مجھ سے کوئی مطالبہ کررہے ہیں" میری آواز بھرّانے لگی۔

"ہاں اگر تم چاہو تو مطالبہ بھی کہہ سکتے ہو" وہ بے نیازی سے بولا۔

"مگر میرے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے" میرا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔

"ہے" وہ معنی خیز انداز میں بولا "شاید تم ڈاکوؤں کے ڈیرے کو بھول گئے ہو۔"

"کیا!" میں اُچھل پڑا "آپ کا مطلب ہے کہ میں وہاں تک آپ کی رہنمائی کروں؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میرے اندر اُٹھتے بدگمانی کے بادل چھٹ گئے۔

"میں تیار ہوں۔ آپ جب چاہیں میں لے چلوں گا" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"ایسے نہیں پہلے تم پوری طرح صحت یاب ہو جاؤ۔ اس عرصے میں ہمیں بھی کچھ تیاریاں کرنی ہیں۔"

"تیاریاں کیسی!"

"تم انہیں معمولی ڈاکو مت سمجھو۔ وہ ایک چھوٹی موٹی فوج ہیں اور اگر ہوشیار ہو جائیں تو ہفتوں ہمارا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحے کے ڈھیر ہیں۔ اس پورے علاقے میں ان کے مخبر پھیلے ہوتے ہیں۔ پولیس میں ان کے زر خرید موجود ہیں جو ان کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کی خبر انہیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ پھر اس علاقے میں انہیں ہوم گراؤنڈ کا ایڈوانٹیج حاصل ہے۔ چنانچہ ان کے خلاف کچھ کرنے سے قبل ہمیں خاصا ہوم ورک کرنا پڑے گا" اس نے تفصیل سے بتایا۔

دو دن آرام اور تفریح کے بعد میں خاصی حد تک فٹ ہوگیا۔ آرام میں کرتا اور تفریح دونوں لڑکے کرتے۔ اس دوران میں انہوں نے اپنا گھر، فارم اور ارد گرد کا علاقہ مجھے بڑی تفصیل سے دکھایا۔ فرہان علی کا ہارس فارم اوسط درجے کا تھا جس میں تقریباً درجن بھر گھوڑوں کی گنجائش تھی اور وہاں اس وقت بھی سات گھوڑے موجود تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ فرہان علی واقعی بہت اچھا ٹرینر تھا۔ اس نے میرے سامنے ایک سرکش گھوڑی کو لگام ڈالنے اور اس پر سوار ہونے کا مظاہرہ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم انٹیلی جنس کو چھوڑ دو اور یہی کام کرلو" میں نے اسے مشورہ دیا۔ اس عرصے میں آپ جناب کا تکلف ختم ہوچکا تھا "بہت سے شوقین حضرات ان گھوڑوں کے لاکھوں دے دیتے ہیں۔"

"حکیم جالینوس، سب کام پیسے کے لئے ہی نہیں کیے جاتے ہیں۔ کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو انسان اپنی تسکین کے لئے کرتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے مصوروں کو، خاص قسم کے دستکاروں کو۔ وہ کام پیسے کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے کرتے ہیں۔ مجھے بھی ایسا ہی فنکار سمجھ لو۔ جب میں کوئی ایسا خطرناک کام جس میں میری جان کو خطرہ ہو محض اپنے ملک کے لئے اپنی قوم کے لئے کرتا ہوں تو مجھے وہی لذت محسوس ہوتی ہے جو ایک مصور کو اعلیٰ درجے کی تصویر بنا کر ہوتی ہے۔"

فرہان علی جیسے لوگ ہی ملک کا اصل اثاثہ ہوتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو قومی و ملکی مفاد کے لئے یوں اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان فتنوں کا سدِباب کرتے ہیں جو اس ملک کی پاکیزہ فضا کو آلودہ کیے دے رہے ہیں۔ اور ہم جیسے لوگ جو پیدا ہونے، زندگی گزارنے، عیش کرنے اور پھر مر جانے کے نظریے پر کاربند ہیں اس وقت تک فرہان علی جیسے لوگوں کی عظمت کا ادراک نہیں کرسکتے ... جب تک ہم پر کوئی ایسی ہی افتاد نہ آن پڑے۔

○☆○

میں منتظر تھا کہ کب ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے کی مہم کا آغاز ہوتا ہے۔ ان دنوں فرہان علی بھی گھر پر کم ہی ٹکتا تھا۔ دن رات میں بمشکل چند گھنٹے وہ گھر میں گزارتا اور اس دوران میں بھی وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ شانی اور کامی بھی اپنے باپ کی غیر موجودگی کا زیادہ نوٹس نہیں لیتے تھے۔ وہ یا تو گھر کے کاموں میں مگن رہتے یا پھر میرے ساتھ مل کر شرارتیں کرنے میں۔ کھانا بنانے میں بھی میں ان کی مدد کردیا کرتا اور وہ مجھے گھڑسواری سکھاتے۔ فرہان اور اس کی بیوی نے دونوں بچوں کو ہر کام میں طاق کردیا تھا۔ نشانہ بازی سے لے کر کھانا پکانے تک وہ ہر کام میں ماہر تھے۔

ایک رات فرہان علی بڑی عجلت میں آیا اور مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔

"اب تمہاری ضرورت ہے برادر عزیز" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"میں تو ہر وقت تیار ہوں۔ تم جب کہو چلتے ہیں" میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں، بات چلنے کی نہیں ہے" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر کیا کرنا ہے۔ بہرحال میں ہر طرح سے حاضر ہوں میرے آقا" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بکو مت" وہ مسکرا کر بولا "تمہیں ڈیرے کی نشاندہی کرنی ہے، بالکل ٹھیک۔"

"ٹھیک کیا میں تم لوگوں کو وہیں لئے چلتا ہوں، سو فیصد۔"

"اونہوں" اس نے پھر نفی میں سر ہلایا اور الماری سے کاغذ کا ایک رول نکالا۔ اس کو کھولا تو اس میں سے ایک کاغذ اور نکلا۔

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

پہلا کاغذ ایک نقشہ تھا۔ جب کہ دوسرا زمین کی ایک تصویر لگ رہا تھا جو شاید فضا سے خاص بلندی سے کھینچی گئی تھی۔ "ہم کو اس نقشے اور تصویر کی مدد سے ڈاکوؤں کے ڈیرے کا پتا چلانا ہے۔"

"مگر یہ سب کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا "جب کہ میں تمہیں براہِ راست وہاں لے جاسکتا ہوں اور پھر یہ نقشہ وغیرہ پڑھنا میرے بس سے باہر ہے جیسے انگریزی پڑھنا تمہارے بس سے باہر ہے۔"

"میرا خیال ہے تمہیں ساری بات بتانی پڑے گی" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "دراصل یہ سارا چکر صرف ڈاکوؤں کا نہیں ہے بلکہ اس سارے معاملے کا مرکزی کردار پڑوسی ملک کا ایک جاسوس ہے۔ وہ عرصہ دراز سے یہاں پر ہمیں بے وقوف بنا رہا تھا مگر ایک دن اس کا بھانڈا پھوٹ گیا اور وہ ہمارے کچھ اہم راز لے کر فرار ہوگیا۔ فرار ہو کر وہ یہیں زمزمہ کے ڈیرے پر آگیا۔ ہم نے فوری طور پر اس پورے علاقے کی ناکا بندی کردی چنانچہ وہ یہاں سے نکلنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔ ہم ہر صورت میں اسے زندہ گرفتار کرنا اور اس کے قبضے میں موجود اپنے راز واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ سارا چکر چلایا جا رہا ہے کیا سمجھے۔"

"سمجھ گیا" میں نے جلدی سے کہا۔ "نقشہ دکھاؤ۔"

نقشہ فوجی ٹائپ کا تھا اور اس میں علاقے کی جزئیات تک محفوظ تھیں۔ باریک لائنوں کی مدد سے علاقے کی ڈگری بتائی گئی تھی۔ اگرچہ یہ نقشہ وغیرہ سمجھنا میرے بس سے باہر تھا مگر قربان کی مدد سے صرف ایک گھنٹے میں 'میں نے زمزمہ ڈاکو کے ڈیرے کو بالکل ٹھیک پوائنٹ کرلیا۔ تمام اہم نشانات اور ڈگری وغیرہ نوٹ کر کے قربان علی نے گرم جوشی سے مجھے گلے لگایا اور میری ہڈیاں کڑکڑا کر خوشی کا اظہار کیا مگر تھوڑی دیر بعد ساری خوشی ہوا ہوگئی۔ جب اس کے سامنے رات کا کھانا رکھا گیا۔ کامی نے پہلے ہی بتا دیا کہ کھانا آج ڈاکٹر انکل نے بنایا ہے۔

"یہ کیا چیز ہے؟" اس نے دہشت زدہ ہو کر سالن کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے چکن قورمہ کہتے ہیں" میں نے متانت سے کہا "بس ذرا سا جل گیا ہے۔"

"یہ ذرا سا جل گیا ہے؟" اس نے ایک کوئلے کی ڈلی جیسی بوٹی اُٹھائی۔

"باقی سالن بہت مزے کا ہے" میں نے اسے یقین دلایا۔ اور وہ پہلا لقمہ لیتے ہی اُچھل پڑا۔

"اتنا نمک" اس نے کہا "کیا کچھ اور نہیں کھانے میں؟"

"جی بابا یہ پڈنگ ہے" شانی نے مستعدی سے لئی جیسی پڈنگ اس کے سامنے کردی۔

"سُنو!" اس نے غرا کر کہا "کل سے تم نے کچن میں قدم رکھا

آزمائش کی کڑی دھوپ میں ایک پاکستانی جاں باز کا سفر

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں...... جب خون جگر برفاب ہوا

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلہ وار شائع ہونے والی مقبول کہانی
علی یار خان کی سرگزشت

مجاہد

کتابی شکل میں چار حصے شائع ہوگئے ہیں

قیمت فی حصہ =/۴۰ روپے ..... ڈاک خرچ ۱۵ روپے
چاروں حصے ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز - پوسٹ بکس نمبر ۲۳ - کراچی نمبر ۷۴۲۰۰

UrduPhoto.com

تو بلا تکلف میں تمہیں واپس سینٹرل جیل پہنچادوں گا۔"

○☆○

حسبِ معمول مجھے جھنجوڑ کر جگایا گیا۔ میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں تو بدستور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں اپنی بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔

"یہ اندھیرا کیوں ہو رہا ہے" میں نے ہوا میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ رات کے بارہ بجے اندھیرا ہی ہوتا ہے" قربان کی آواز ابھری۔

"مگر اس وقت اٹھانے کی کیا تک ہے" میں نے جھلا کر کہا۔

"تھوڑی دیر اور سوتے رہتے تو ہمیشہ کی نیند سو جاتے۔ اٹھو میرے ساتھ چلو خاموشی سے" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ الفاظ کی نسبت اس کا لہجہ بڑا سنگین تھا۔ میں نے چپ چاپ اٹھ کر چپل پہنی اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ اندھیرے میں مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ وہ کہاں لئے جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم گھر سے باہر تھے۔ یہ گھر اور فارم ہاؤس کا درمیانی حصہ تھا۔

"جھک کر چلو مگر تیز" اس نے تقریباً سرگوشی میں کہا اور مجھے کھینچتا قریبی درختوں کے جھنڈ کی طرف لے گیا۔ وہاں اس نے مجھے ایک درخت کے عقب میں بٹھا دیا اور خود اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اس طرح آدھی رات کو جگائے جانا اور یوں پُراسرار انداز میں باہر لانا، میری سمجھ سے باہر تھا۔ اسے گئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ فضا زبردست فائرنگ سے گونج اٹھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کئی درجن گنوں کے دہانے بیک وقت کھل گئے ہوں۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی آتشیں لکیریں بتا رہی تھیں کہ ہدف گھر اور فارم ہاؤس ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں وہاں نہیں تھا ورنہ لکڑی کے بنے اس گھر میں گولیوں کی اس بارش میں بچ نکلنا بہت مشکل ہوتا۔ عین اس وقت ایک گولی سنسناتی ہوئی اس درخت کے تنے پر لگی جس کے عقب میں، میں موجود تھا۔ میں "باپ رے باپ" کہتا زمین پر دراز ہو گیا تھا۔

"خیریت سے تو ہو" عقب سے اچانک قربان نے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں اچھل پڑا۔

"ہاں خدا بھلا کرے اس درخت کا ورنہ میرے مقتول ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔" میں نے جل کر کہا۔ وہ دھیرے سے ہنس پڑا۔

"ابھی دیکھنا اصل شو، بڑا مزہ آئے گا" اس نے مسرور لہجے میں کہا۔ اس وقت تک فائرنگ کی شدت کم ہو گئی تھی بلکہ فائرنگ تقریباً ختم ہی ہو گئی تھی۔ صرف اکا دکا فائر ہو رہے تھے۔ اچانک فضا جیسے جگمگا اٹھی۔ یہ تیز ہائی پاور سرچ لائٹس تھیں جو فارم ہاؤس اور گھر کے چاروں طرف موجود درختوں میں جل رہی تھیں۔ پھر کسی نے میگا فون پر اونچی آواز میں کہا۔

"تمام افراد ہتھیار ڈال دیں، بھاگنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں" اس جملے کے ادا ہوتے ہی فائرنگ پھر شروع ہو گئی۔ اس میں ایک ایل ایم جی کی آواز نمایاں تھی۔ محض چند منٹ جاری رہ کر فائرنگ پھر بند ہو گئی۔

"چلو ڈراما ختم ہو گیا" قربان نے پھر میرا بازو پکڑا۔

مکان کے سامنے کے حصے میں متعدد افراد موجود تھے جن میں سے اکثریت وردی پوش حضرات کی تھی۔ قریباً درجن بھر حملہ آور بھی تھے جن میں سے تین مر چکے تھے۔ دو زخموں سے چور کراہ رہے تھے جب کہ باقی افراد ہاتھ سروں پر رکھے کھڑے تھے۔ ان میں جبار خان بھی تھا۔ اس نے کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"سر" ایک وردی پوش آفیسر نے قربان کو سیلوٹ مار کر کہا "یہ تین بندے مارے گئے ہیں" اس نے زمین پر پڑی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کوئی بچ کر تو نہیں نکل گیا؟"

"نہیں سر، ان میں سے کوئی بھاگنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"ہمارا کوئی نقصان؟"

"سر دو جوان معمولی زخمی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، لاشیں اٹھاؤ اور زخمیوں کو اسپتال منتقل کرو اور انہیں فی الوقت اپنی تحویل میں رکھو۔" اس نے جبار خان اور اس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اندر پہنچ کر وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

"اب مجھے بتا بھی چکو کہ یہ چکر کیا ہے، ان ڈاکوؤں نے یہاں کس خوشی میں دھاوا بولا تھا۔"

"ذرا صبر" وہ جیب سے موبائل نکالتا ہوا بولا "ہیلو ارشد۔ سی او کالنگ۔ ہاں صورتِ حال کیا ہے۔ ہاں یہاں پر آپریشن کامیاب رہا۔ ہیلی کاپٹر کتنی دیر میں پہنچیں گے؟" وہ سننے لگا

"ٹھیک، کام مکمل ہوتے ہی مجھے رپورٹ کرو" اس نے فون بند کر دیا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں اس سارے ڈرامے کا پس منظر سمجھایا جائے" اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا "جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ساری اہمیت ایک شخص اور اس کے قبضے میں موجود شے کی تھی جس کی وجہ سے اتنا لمبا کھڑاگ پھیلانا پڑا۔ یہاں پر ڈاکوؤں کا حملہ بھی ہماری پلاننگ کے مطابق ہوا۔ تاکہ ایک تو ان کے اڈے پر افرادی قوت کم ہو جائے اور ان کی توجہ بھی بٹ جائے۔"

"مگر انہوں نے یہاں حملہ کیوں کیا؟" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"تمہارے لئے میرے چاند" وہ معنی خیز لہجے میں بولا "تم ان کے ٹھکانے سے واقف تھے چنانچہ وہ تمہارے لئے پاگل ہو رہے

UrduPhoto.com

تھے۔ ہم نے ان کے نمک خوار پولیس والے کے ذریعے یہ خبر ان تک پہنچا دی کہ تم یہاں ہو اور صبح یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اسی لئے وہ سوچے سمجھے بغیر یہاں بھاگے آئے اور ہمارے جال میں پھنس گئے۔"

"اور اگر وہ یہاں نہ آتے تب؟"

"تب بھی ہمیں اپنا کام کرنا تھا۔ بس ذرا مشکلات زیادہ ہو جاتیں۔ اب ہمارا ٹارگٹ نسبتاً آسان ہو جائے گا۔"

"یعنی اب ڈیرے پر حملہ کرو گے۔ میرا خیال ہے یہ کام ذرا مشکل ہے' وہاں کے پہرے دار بڑے مستعد ہوتے ہیں۔ پھر ڈیرے کے چاروں طرف واچ ٹاور پر بھی محافظ ہوتے ہیں۔ جو دور دور تک دیکھ سکتے ہیں ایسے میں تمہارے آدمی نظروں میں آئے بغیر وہاں تک کیسے پہنچیں گے۔"

"آسمان سے" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "ہمارے جوان ہیلی کاپٹر سے' پیرا شوٹ کی مدد سے چھلانگ لگائیں گے اور سیدھے ڈیرے پر لینڈ کریں گے۔ چھت پر اُترتے ہی وہ بے ہوش کر دینے والی گیس کے بم استعمال کریں گے اور جب مزاحمت کمزور ہو گی تو اچانک دھاوا بول کر سب کو گرفتار کر لیں گے۔"

"مگر اتنے اندھیرے میں وہ بالکل ٹھیک جگہ کیسے اُتریں گے اور پھر کیا بے ہوش کرنے والی گیس خود ان پر اثر انداز نہیں ہو گی؟" میں نے اپنی دانست میں زبردست اعتراض کیا۔

"بڑی آسانی سے" ان کے پاس ڈگری بتانے والے آلے ہوں گے۔ پھر وہ اندھیرے میں دیکھنے والے انفرا ریڈ گلاسز پہنے ہوں گے گیس سے بچنے کے لئے گیس ماسک ہوں گے۔"

"ٹاور پر موجود پہرے دار خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں" میں نے اظہارِ خیال کیا۔

"اتنا رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ ویسے تم فکر نہ کرو ہمارے کمانڈوز بہت ماہر ہیں۔"

"تم نے اس شخصیت کو بڑا پُراسرار کر رکھا ہے جو وہاں ڈیرے پر موجود تھی۔ مجھے بھی تجسس سالاحق ہو گیا ہے کہ وہ شخص کون ہے جس کے لئے اتنے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔"

"تھوڑی دیر کی بات ہے تم دیکھ ہی لو گے۔"

"ویسے مجھے ایک شخص کی بڑی فکر ہے کہ اسے کچھ ہو نہ جائے۔"

"وہ کون ہے؟" فرحان نے دلچسپی سے پوچھا۔

"خادم بخش! اس نے میری وہاں پر بڑی خدمت کی اور یہ جو آج میں زندہ سلامت تمہارے سامنے بیٹھا ہوں یہ بھی اسی کا احسان ہے۔ اگر وہ اپنی جان پر کھیل کر مجھے وہاں سے فرار نہ کرواتا تو اب تک میری ہڈیاں بھی لاپتا ہو چکی ہوتیں۔"

"تم فکر مت کرو' میں اس کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ فون بیل دینے لگا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ایریل باہر کھینچا۔

"سی او اسپیکنگ! ہاں کیا ہوا' وہاٹ؟" وہ دہاڑا۔ "کیسے نکل گیا اور کہاں نکل گیا۔ پورا علاقہ چھان مارو۔ وہ جانے نہ پائے۔ ناؤ ہری اَپ" وہ یکدم بہت پریشان نظر آنے لگا تھا۔

"کیا ہوا' کون فرار ہو گیا جو تم اتنے پریشان ہو رہے ہو۔"

"وہ مردود پھر فرار ہو گیا" اس نے ہتھیلی پر گھونسا مار کر کہا "نہ جانے کیسے نکل گیا جب کہ ڈیرے کو چاروں طرف سے میرے جوانوں نے گھیر رکھا تھا۔"

"اب تو مجھے بھی اس بندے سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا ہے جو تم جیسے شخص کو برابر جُل دیے جا رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم صرف تصویر پر گزارا کر لو کیونکہ اس کا ہاتھ آنا تو مشکل ہی لگ رہا ہے" اس نے جیب سے ایک پاسپورٹ سائز تصویر نکالی اور مجھے تھما دی۔

"خادم بخش" تصویر دیکھتے ہی میں اُچھل پڑا۔

"جی آپ کا خادم سائیں!" دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ اب کہ ہم دونوں اچھل پڑے وہاں خادم بخش کھڑا تھا۔ ڈیرے والے ڈرپوک خدمت گار خادم بخش سے بہت مختلف۔ اس وقت وہ ڈھیلے ڈھالے شلوار کرتے کے بجائے سیاہ کلر کی پینٹ اور سیاہ ہی جرسی پہنے ہوئے تھا۔ اس کی کمر پر ایک بیگ بندھا تھا جب کہ کندھے پر سب مشین گن لٹک رہی تھی اور سب سے خطرناک پوزیشن میں اس کا دایاں ہاتھ تھا جس میں مشین پسٹل

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

موجود تھا۔

"تم دونوں اوندھے منہ لیٹ جاؤ" وہ بڑے محتاط انداز میں ایک قدم آگے آتے ہوئے بولا۔

میں نے فرمان کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر خاموشی سے "خادم" کے حکم کی تعمیل کی۔ اگر خادم کی جگہ زمرمہ ڈاکو کی روح بھی آجاتی تب بھی مجھے اتنی حیرانی نہ ہوتی۔ یہ سوچ سوچ کر میرا بُرا حال ہو رہا تھا کہ یہ شخص مسلسل اتنے دنوں تک مجھے بے وقوف بناتا رہا اور مجھے ایک لمحے کے لئے بھی اس پر شک نہیں ہوا۔ بلکہ اُلٹا میں اسے اپنا محسن سمجھ رہا تھا۔

اس نے بڑی پھرتی سے میری اور فرمان کی جامہ تلاشی لی اور جو کچھ ہمارے پاس سے نکلا وہ اس کے قبضے میں چلا گیا۔ تلاشی لے کر وہ دوبارہ پیچھے ہٹ گیا۔

"کھڑے ہو جاؤ' ہاتھ اپنے اوپر اُٹھا کر۔"

"تم بچ کر کیسے نکلے؟" فرمان نے اٹھتے ہوئے بڑے پر سکون انداز میں پوچھا۔

"اس احمق جبار خان کو میں نے منع کیا تھا مگر وہ اندھے بیل کی طرح منہ اُٹھائے یہاں دوڑا آیا اور پھنس گیا۔ میں ان کے پیچھے آیا تھا اور اس حرکت نے مجھے بچا لیا۔ میں یہیں ایک درخت پر بیٹھا ان سب کا کریا کرم ہوتے دیکھ رہا تھا اور جب تمہارے آدمی یہاں سے رخصت ہو گئے تو میں یہاں آگیا۔"

"تو تمہارے خیال میں تم بچ جاؤ گے؟" فرمان نے طنزیہ انداز میں کہا "میرے خیال میں تم نے یہاں آکر بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔"

"اس کے برخلاف میں نے یہاں آکر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے" وہ مسکرایا "اب دیکھو تمہارے کُتے مجھے ہر جگہ تلاش کر رہے ہوں گے سوائے اس جگہ کے اور پھر یہاں پر گاڑی بھی ہے یوں شہر جانے میں بھی آسانی ہو گی۔ کیوں سائیں؟" وہ بڑی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"یہ خوش فہمی ہے تمہاری! ابھی میرے جوان یہاں آنے والے ہیں اور اگر تم یہاں سے بچ بھی گئے تو شہر نہیں پہنچ سکو گے۔ یہاں سے جانے والی ہر گاڑی کی چیکنگ ہو گی' چاہے وہ میری ہی کیوں نہ ہو۔"

"تم نے مجھے فرار کرانے کی مہربانی کیوں کی تھی؟" میرے ذہن میں چُبھنے والی بات آخر زبان پر آہی گئی اور میں اس کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول رکھنا چاہتا تھا کیوں کہ کھڑکی کے قریب کھڑے کامی کی جھلک میں دیکھ چکا تھا۔

"میں نے چارے کے طور پر ان لوگوں کے سامنے تمہیں ڈالا تھا تاکہ ان کی توجہ تمہاری طرف ہو اور مجھے نکلنے کا موقع مل سکے مگر لعنت ہو اس شخص پر" اس نے فرمان کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ہمیشہ میرے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی ہیں" اس نے غضب ناک ہو کر پستول کو خطرناک انداز میں جنبش دی اور دانت پیس کر کہا "مگر اس کی یہ کوشش آخری ثابت ہو گی۔"

اس کے اشتعال کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ فرمان کو گولی نہ مار دے اور شاید یہی بات باہر کھڑے کامی نے بھی محسوس کرلی۔ وہ بڑی عجلت سے اندر داخل ہوا۔ اندر آتے ہوئے اس کے ہاتھ میں موجود لوہے کا راڈ دروازے سے ٹکرا گیا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی "خادم" زخمی سانپ کی طرح پلٹا۔ کامی بالکل اس کے سامنے تھا۔ وہ اگرچہ اس کے سر پر مارنے کے لئے راڈ اٹھا چکا تھا مگر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ خادم اس پر گولی چلا دے گا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فرمان دور تھا جب تک وہ اس تک پہنچتا گولی چل چکی ہوتی۔ اس موقع پر نہ جانے کیسے مجھ میں اتنی جُرات پیدا ہو گئی کہ میں نے جان کی پروا کیے بغیر "خادم" پر چھلانگ لگا دی۔

میرے گھٹنے اس کی کمر سے جا ٹکرائے۔ اسی دوران میں وہ ٹریگر دبا چکا تھا مگر ٹکر سے اس کا توازن بگڑ گیا اور گولی کامی کے قریب سے نکلتی ہوئی دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہو گئی۔ خادم بخش میری شان میں نازیبا کلمات کہتا ہوا کھڑکی کی گرل سے جا ٹکرایا۔

فرمان کے لئے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ بگولے کی طرح اُٹھا اور طوفان کی طرح خادم پر چھا گیا۔ پستول اس نے چھین کر میری طرف اچھال دیا اور پھر ہر اس طریقے اور چیز سے اس کی خاطر تواضع کرنے لگا جو اس کی سمجھ میں آیا اور اسے دستیاب ہوئی۔ اچھا خاصا ہٹا کٹا ہونے کے باوجود خادم بخش صرف دس منٹ میں ہوش و حواس کی دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔

اس کے بعد فرمان نے اسے سر سے پاؤں تک کھنگالا اور آخر ایک پوشیدہ مقام سے ایک سیاہ رنگ کی چوکور ڈبیا برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈبیا ملتے ہی اس نے خوشی سے بھرپور ایک قہقہہ لگایا پھر اپنا موبائل اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ہیلو! ہی او' پیکنگ! سنو! وہ شخص میری رہائش گاہ پر پہنچ گیا تھا۔ اب قابو میں ہے۔ فوراً اسے اپنے ہیڈ کوارٹر منتقل کرو ہری اَپ" اس نے کال منقطع کرکے دوسرا نمبر ملایا "ہیلو' فرمان علی اسپیکنگ سر! آپریشن مکمل ہو گیا۔ مجرم بھی پکڑا گیا ہے اور چیز بھی مل گئی ہے۔ یس سر تھینک یو' میں خود لے کر حاضر ہوں گا سر۔"

اتنی دیر میں 'میں' ڈاکٹر کی حیثیت سے "خادم بخش" کا معائنہ کر چکا تھا۔ اس کی تمام تر خراب حالت کے باوجود اس کی زندگی کو فی الحال کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔

صرف دس منٹ بعد دو تیز رفتار جیپیں مکان کے احاطے میں آکر رُکیں۔ ان میں سے جوان کود کر اُترے اور دوڑتے ہوئے اندر گھس آئے۔ فرمان پر نظر پڑتے ہی انہوں نے ایڑیاں بجا کر سلام کیا۔

UrduPhoto.com

"اس مردود کو بڑی حفاظت اور رازداری سے لے جانا ہے۔ اسے میڈیکل ٹریٹ منٹ دو تاکہ یہ کل تک ڈائریکٹر صاحب سے ملاقات کے قابل ہوسکے اور سنو مزید جوان منگوالو اور میرے گھر کے اردگرد پورے ایریے کی نگرانی کرو" فرحان نے انہیں ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"یس سر" اس کے نائب نے کہا اور احکامات کی تعمیل میں مصروف ہوگیا۔

○☆○

دوسرے دن میں پھر سینٹرل جیل میں موجود تھا۔ اگرچہ صورتِ حال پہلے کی نسبت خاصی حوصلہ افزا تھی مگر قید بہر حال قید ہوتی ہے۔ پھر میرا دل اس خدشے سے بھی لرز رہا تھا کہ کہیں میرے ساتھ وہی سلوک نہ کیا جائے جو مفرور ملزموں اور مجرموں کے دوبارہ ہاتھ آنے کی صورت میں ان کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ جیل انتظامیہ کی گڈ بک سے تو میں خارج ہو ہی چکا تھا۔ مگر یہ خدشات، خدشات ہی رہے۔ فرحان علی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی مجھے ضمانت پر رہا کرالے گا۔ مگر میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یہ کام تیسرے ہی روز کرلے گا۔

جیل سے باہر میرا استقبال یوں کیا گیا جیسے دبئی سے آنے والے کماؤ پوت کا کیا جاتا ہے۔ استقبالیہ کمیٹی میں ظاہر ہے کہ امی، ابو اور غزل تو موجود تھے ہی ان کے علاوہ ڈاکٹر قیوم بھی موجود تھے۔ میری ضمانت انہوں نے ہی دی تھی۔

پھر وہاں ہونے والے جذباتی سین دیکھ کر فرحان جیسا شخص بھی آبدیدہ ہوگیا۔ (بعد میں اس نے اسے اپنی اداکاری قرار دیا) غزل کا پھول سا چہرہ میری جدائی میں کمہلا کر رہ گیا تھا۔ دل تو بے تاب تھا مگر ابو اور امی کی موجودگی کی وجہ سے اسے کچھ کہہ نہ سکا۔ فرحان علی شام کو گھر آنے کا کہہ کر رخصت ہوگیا۔ غزل اور ڈاکٹر قیوم ڈیوٹی سے آئے تھے لہٰذا وہ بھی چلے گئے اور میں امی اور ابو کے ساتھ گھر آگیا۔

گھر آکر امی نے لاڈ پیار کا ایسا مظاہرہ کیا کہ جیسے میں ابھی ابھی پیدا ہوا ہوں۔ میں نے اپنے شبے کا اظہار کیا تو وہ ہنس پڑیں۔

"بیوقوف نہ ہو تو! بچے کتنے بڑے ہوجائیں ماں کے لئے بچے ہی رہتے ہیں" وہ بڑی صفائی سے ابو کا ذکر گول کر گئیں۔ جس پر وہ انہیں گھور کر رہ گئے۔

فرحان علی میرے اندازے کے عین مطابق شام کے بجائے رات کو آیا اور آتے ہی اس نے کھانے کا نعرہ بلند کیا۔

"یہ ہوٹل نہیں ہے جہاں تم کھانے کا آرڈر دے رہے ہو، لہٰذا کام کی بات کرو۔"

"اچھا جی! ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں۔ بہر حال برخوردار ایسا کرنا اپنے کیس کے تفتیشی افسر سے رابطہ قائم کرلینا اور اس سے کام کی بات پوچھ لینا۔ انشاء اللہ وہ تمہیں تمام کام کی باتیں بتادے گا" اس نے کہا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا جو امی اس کے لئے لائی تھیں۔

"خالہ جی" وہ نوالہ چباتے ہوئے امی سے بولا "آپ کے ہاتھ میں کیا ذائقہ ہے۔ یہ تو نرا ڈاکٹر ہے اور اس کے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے سے بہتر ہے کہ بندہ وہ کڑوی دوائیاں پی لے جو یہ اپنے مریضوں کو دیتا ہے۔"

"میں ڈاکٹر ہوں کوئی باورچی نہیں ہوں" میں نے غرا کر کہا۔

کھانے کے بعد اس کا کھلنڈرا پن یکدم رخصت ہوگیا اور وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا "تمہارے کیس کے تفتیشی افسر کو اس بات پر بڑی مشکل سے رضا مند کیا ہے کہ وہ ہمارے تشکیل کردہ خطوط پر کام کرے۔ اس کا ایس پی میرا دوست ہے اس وجہ سے وہ رضا مند بھی ہوگیا" وہ سگریٹ سلگا کر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا "اس کیس میں تمہاری بچت کا ایک ہی طریقہ ہے کہ فائزہ نامی نرس اپنا بیان تبدیل کردے۔ ہم بھی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کیونکہ استغاثے کی اہم ترین گواہ ہے اس لئے اس پر براہِ راست دباؤ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔"

"پھر کیا کر رہے ہو؟"

"کر رہے ہیں کچھ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے ہیں" اس کا انداز مبہم تھا۔

داخلے کے لئے
خط لکھیں

خواتین و حضرات! ہم بذریعہ ڈاک

• انگلش لینگویج • پینٹنگ • فلاور میکنگ
• بیوٹیشن • فنشنگل بیوٹی • انٹیریئر ڈیکوریشن
• لیڈیز ٹیلرنگ • کوکنگ بیکنگ
• مہرسازی • فوٹوگرافی • کمرشل آرٹ
• ریفریجریشن • میڈیکل ایڈ • اسکول ٹیچنگ

اور ریڈیو ٹی وی پر اردو میں باتصویر لیکچرز و کتب کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں۔ داخلے کیلئے تفصیلات جوابی لفافے سے منگائیں۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔

اسلام آباد اکیڈمی
۲۵۱ بیکٹر آئی۔ٹین۔ون، اسلام آباد

UrduPhoto.com
UrduPhoto.com

"ذرا تحمل کر بات کرو۔"

"چپ رہو حکیم جالینوس" وہ بولا "یہ تفتیشی امور ہیں' تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔" وہ دوبارہ اپنی پہلی والی جون میں آگیا اور اب اس سے بات کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی کوششیں ترک کردیں۔

رات تقریباً دو بجے جب میں ایک حسین وادی میں غزال کے ساتھ ٹہل رہا تھا' فون کی گھنٹی نے صور پھونکا اور تمام منظر کا بیڑا غرق کردیا۔ تیسری کوشش میں ریسیور مجھے مل گیا۔

"کون ہے اس وقت! کسے میری ضرورت پڑ گئی" میں نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سرکاری جلاد کو" دوسری طرف فرمان علی تھا "تیرا کام ہوگیا ہے بلکہ سمجھو تمام ہوگیا ہے۔"

"یہی بکواس سنانے کے لئے فون کیا تھا۔"

"وہ علامہ صاحب فرما گئے ہیں کہ اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو۔"

"لیکن میں تو ڈاکٹر ہوں" میں نے بھنا کر کہا۔

"ایک ہی بات ہے' علامہ نے ہی بتایا کہ پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں۔"

انہوں نے غریبوں کو کہا تھا جاہل' اور یہ بھی نہیں کہا تھا کہ آدھی رات کو فون کرکے شرفا کو تنگ کیا کرو۔"

اس نے ایک بھرپور قہقہہ ارسال کیا اور بولا "شرفا! بیٹے تیرا نام تھانے میں درج ہے اور تو خود کو شریف کہہ رہا ہے۔"

"خدارا اب بک چکو! کیوں فون کیا ہے" میں نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"تو پھر سنو جگر تھام کے' وہ تیرا طارق عباس پکڑا گیا ہے۔"

"طارق پکڑا گیا!" میں اُچھل پڑا "کب' کیسے' کہاں؟"

"ایک ویمن ہوسٹل میں جہاں فائزہ چھپی ہوئی تھی۔ رات تقریباً گیارہ بجے۔ اگر چند لمحوں کی دیر ہوجاتی تو وہ اسے مار چکا ہوتا۔"

"سن یار تو یہاں آجا ابھی" میں نے لہجے میں مٹھاس بھر کر کہا۔

"کیوں تجھے سونا نہیں ہے اور پھر میں کیوں آؤں؟ تو کیوں نہیں آجاتا۔"

"تیرے پاس گاڑی ہے اور وہ بھی سرکاری' میرے پاس تو سائیکل بھی نہیں ہے۔"

"اچھا پھر میں آتا ہوں" وہ بادلِ ناخواستہ بولا اور ریسیور رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ میرے سامنے موجود تھا۔

"مت پوچھ تیرے لئے مجھے کیا کیا نہیں کرنا پڑا۔ اس خبیث الدہر شخص سے بات لینی پڑی جس سے پچھلے پانچ سال سے میری بات چیت بند ہے جو اتفاق سے تیرے کیس کا انچارج بھی ہے اور میرا سالا بھی۔"

"وہ تیرا سالا ہے" میں بھونچکا رہ گیا "خیر وہ تیرا سالا ہی ہوسکتا ہے۔ بہرحال چھوڑو ان باتوں کو اصل بات کی طرف آؤ۔"

جواب میں اس نے ایک لمبی چوڑی رپورٹ مجھے سُنائی جس کا خُلاصہ کچھ یوں تھا۔

فرمان کا سالا نہایت گھاگ قسم کا پولیس والا تھا۔ وہ زندہ تو کیا مُردے تک سے اقرارِ جرم کراسکتا تھا۔ تشدد کے تمام حربے فرسٹ ڈگری سے لے کر تھرڈ ڈگری تک اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اس نے فائزہ پر یہ واضح کردیا کہ اس کا وجود قاتل کے لئے خطرے کا باعث ہے اور وہ کسی وقت بھی اسے اپنے راستے سے ہٹا سکتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہی خیال اس کے ذہن میں بھی ہو۔ چنانچہ چور کی داڑھی میں تنکے کے مصداق اسے اپنی فکر لگ گئی۔ اور وہ فرمان کے سالے کی ہدایت پر اسپتال سے لمبی چھٹی لے کر روپوش ہوگئی جہاں کا پتا سوائے فرمان کے سالے کے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ فائزہ کے غائب ہوتے ہی طارق عباس جیسے پاگل سا ہوگیا کیونکہ اس کی زندگی فائزہ کی زبان بندی میں محفوظ تھی اور زبان کھلتے ہی وہ کہیں کا نہ رہتا۔ شاید وہ بھی فائزہ کے لئے دل میں کوئی منصوبہ ترتیب دے چکا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس پر عمل درآمد وہ اس وقت ہی کرسکتا تھا جب فائزہ اپنا کام مکمل کرلے یعنی میرے خلاف گواہی دے لے۔

ایک دن باتوں باتوں میں گویا نادانستگی میں طارق کے سامنے فرمان کے سالے انسپکٹر نے اس جگہ کا پتا اگل دیا جہاں فائزہ روپوش تھی۔

پتا چلتے ہی وہ اس طرح لپکا جیسے شارک خون کی بو پر اپنے شکار پر جھپٹتی ہے۔ رات تقریباً گیارہ بجے وہ اس جگہ پہنچا اور اس نے کھلی کھڑکی سے سوتی ہوئی لڑکی (وہ ڈمی تھی) پر فائر کردیا۔ دوسرا فائر کرنے سے پہلے ہی پولیس کے جوان اسے قابو کرچکے تھے۔ خود کو چاروں طرف سے محصور پاکر اس نے اعترافِ جرم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

"یہ ہے ساری داستان" اس نے آخر میں کہا اور داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اب آپ دفع ہوجائیں کیونکہ مجھے نیند آرہی ہے" میں نے مصنوعی جماہی لی۔

"بیٹے تم کیا سمجھتے ہو تم بچ جاؤ گے" اب بھی تمہیں عمرقید تو ہوسکتی ہے۔"

"عمرقید! وہ کیسے؟" میری نیند ایک بار پھر اُڑ گئی۔

"ایک حسین جرم کے بدلے" اس نے قہقہہ مار کر کہا اور رخصت ہوگیا۔

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com